

قیما آباد  
پاکستان

ماہنامہ  
میلیہ

رجح الاول ۱۴۳۲ھ بمطابق فروری، مارچ ۲۰۱۱ء

[www.milliafsd.com](http://www.milliafsd.com)

ورقنا کھڑک  
۱۳۹۷ھ

مدیر اعلیٰ و سرپرست

ابو نعیم مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی  
خلیفہ مجاز حضرت سید نقیس الحسنی رحمہ اللہ



# سلام بھیجو

دروود

بھیجو

سلام

بھیجو

بھیجو

الانام

خیر

بنام

نَفْسِ نَفْسِ

کا

سکون

اُن سے

جو

بھیجو

صد

احترام

بھیجو

خدا کی ہستی کے بعد وہ ہیں

جو

بھیجو

حسبِ

مقام

بھیجو

کھلا ہے دربارِ عالی ہر وقت

گو

صبح

بھیجو

یا

شام

بھیجو

جو

حاضری ہو

مواجهہ

پر

بچشمِ

تر

خود

کلام

بھیجو

ملائکہ کے

حسین

چلو

میں

جو

دور

ہو

تو

پیام

بھیجو

کبھی نہ

سستی

و

کاہلی

ہو

جو

بھیجو

بالالتزام

بھیجو

دروود کے

بدلے

حشر کے

دن

ملے

گا

کو

ثر

کاجام

بھیجو

مقامِ محمود

اُن کا

رُتبہ

عقیدتیں

اپنی

تام

بھیجو

نوازشیں اُن کی

ہم

پہ

ہردم

سلام

بھیجو

مدام

بھیجو

حبیبِ

وہ

ہیں

شفیعِ

محشر

یہ

ٹوٹا

دل

اُن کے

نام

بھیجو



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# ماہنامہ عالمی

فیصل آباد  
پاکستان

## فہرست مضامین

کلمۃ الحبیب

- **با محمد ﷺ ہوشیار**  
2  
ابنیں حبیب الرحمن لدھیانوی
- **تحریک ختم نبوت تاریخ کے آئینے میں**  
12  
ابنیں حبیب الرحمن لدھیانوی
- **قاضی شریح**  
20  
ڈاکٹر خورشید احمد فارق، دہلی
- **پرہیز گار وہی ہیں جو حقوق کی ادائیگی کرتے ہوں**  
30
- **انبیاء کی فضیلت اولیاء پر**  
34
- **شذرات**  
39
- **کائنات کی تخلیق کے سلسلہ میں فلسفہ قدیم اور سائنسی نظریات کی تردید اور اسلامی نظریہ تخلیق کا اثبات و احقاق**  
48  
(مولانا) حذیفہ دستاوی
- **نعت**  
42

جلد نمبر 7 ربيع الاول 1432ھ

بمطابق

فروری۔ مارچ 2011ء شماره نمبر 3

بیاد

حضرت مولانا انیس الرحمن لدھیانوی  
خلیفہ مجاز حضرت شاہ عبدالقادر رانی پوری

بفیض

حضرت سید نفیس الحسنی  
رحمۃ اللہ علیہ

مدیر اعلیٰ و سرپرست

ابنیں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی

فی شماره 20 روپے پاکستان میں سالانہ 200 روپے  
سالانہ بدل اشتراک بیرون ملک 40 امریکی ڈالر

نائب مدیر

جولاء الرحمن لدھیانوی

مدیر

جولاء الرحمن لدھیانوی

محکمہ خالصہ، کالج P.O مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

041-8711569

0321-6611910

جامعہ ملیہ اسلامیہ

ماہنامہ عالمی

رابطہ کے لیے

ناشر..... حبیب الرحمن لدھیانوی مطبع: ظفر اینڈ فضل پرنٹنگ پریس فیصل آباد Decl No. 3483-85



کلمہ الحبيب

# با محمد ﷺ ہوشیار

ابنِ حبیب الرحمن لدھیانوی

الحمد لله و کفی و سلام علی عباده الذین اصطفی۔

احتجاج ہو رہا تھا، مظاہرے عروج پر تھے، پریس کانفرنسیں ہو رہی تھیں، ہڑتال کامیاب ہو چکی تھی، پھر بھی کوئی ٹس سے مس نہ ہوا، کسی نے بھی اس مسئلہ کو سنجیدگی سے نہیں لیا، ہر شخص اپنی ہانکے چلا جا رہا تھا۔ اور اپنے طور پر اپنی اپنی افلاطونی تفاسیر بیان کرتا رہا۔ لوگ بولتے رہے، ٹی وی انکرا نہیں بلواتے رہے، علماء پر جہلا کے طعنوں کے تیر و نشتر چلتے رہے، دینی غیرت والے عوام میں غصہ پلتا رہا بڑھتا رہا۔ جب علمی زاویے ہر کس و تناکس کی چرب زبانی اور شعلہ بیانی کے رحم و کرم پر آ جائیں تو بے بس اپنی سمجھ کے مطابق انصاف کرتے ہیں۔ وہ اس خیال سے بے نیاز ہو جاتے ہیں کہ قانون کی نگاہ میں ان کو کس زاویے سے دیکھا جائیگا۔ ارد گرد سے آنے والی آوازیں انہیں فیصلہ ساز بنا دیتی ہیں۔ وہ ایسا کر گزرتے ہیں کہ مخالف انہیں مجرم اور تاریخ لکھنے والے اسے ہیرو قرار دیتے ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ اصل مجرم چھپا ہوا وہ خاموش ہے جو باختیار ہونے کے باوجود قتل ہونے تک ہوا کا رخ بھانپتا ہے۔

حالات بدل رہے ہیں، تاریخ بدل رہی ہے، سیاست کے تیور اچھے دکھائی نہیں دیتے۔ سیاست دان انگشت بدنداں ہیں۔ عالم اسلام میں ایک شور برپا ہے۔ ہر طرف بے چینی ہے۔ نظر تو بہت کچھ آ رہا ہے مگر بڑے بڑے جغادری قسم کے سیاستدانوں کو بھی سُجھائی کچھ نہیں دیتا۔ سہمے بیٹھے ہیں، ان کو اپنے کارندوں، اپنے محافظوں پر سے اعتماد اٹھ چکا ہے، کہ کہیں ممتاز قادری جیسا ان کی صفوں میں نہ گھس گیا ہو۔ سلیمان تاثیر کے قتل پر لوگوں کا رد عمل عجیب دیکھنے میں آیا، اس کا جنازہ پڑھانے والا کوئی مولوی نہ ملا، کسی مسجد میں اس کے لیے فاتحہ خوانی نہیں کی گئی۔ البتہ تمام عیسائی چرچوں میں شمعیں روشن کی گئیں۔ حیاء، شرم، غیرت اور ایمان سے عاری سول سوسائٹی نے ڈرتے ڈرتے اس میں اپنا کچھ حصہ ضرور ڈالا تا کہ باہر سے آئی ہوئی امداد کو حلال کیا جاسکے۔



یہ پُر اسرار سول سوسائٹی جو غیر ملکی پرفیوم میں نہا کر انگریزی پلے کارڈ اٹھا کر جلتی ہوئی شمعوں میں مقتول گورنر کے لئے انصاف مانگتی ہوئی نظر آئی۔ یہ کبھی عافیہ کی رہائی، علماء کے قتل، حدود اللہ کی پامالی، امبریل کی طرح پروان چڑھتی ہوئی بے حیائی اور خواتین کے میراتھن کے خلاف مظاہرہ کرتی ہوئی کہیں نظر نہیں آئی۔ بیش قیمت سن گلاسز کے پیچھے صرف اپنی مرضی کے نظارے دیکھنے کی خواہشمند سول سوسائٹی محدب عدسہ لے کر تلاش کرنے سے بھی دکھائی نہ دی۔ جب عافیہ کو برہنہ کر کے تلاشی لی گئی، اس کے پیروں میں قرآن پھینکا گیا، اس کا اسکارف پھاڑا گیا، اس وقت یہ سوسائٹی نہ جانے کہاں آرام فرماتھی۔ اگر اس سول سوسائٹی کے نزدیک واقعی توہین رسالت کے قانون میں سقم کو دور کرنا مقصود ہے تو پاکستان میں ایک ہزار کے قریب توہین رسالت کے مقدمات درج ہوئے، ان میں آٹھ سو کے قریب ایسے ہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کے خلاف تھے مگر کبھی بھی سول سوسائٹی کی آواز ان کے حق میں نہیں اٹھی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مسلمان توہین رسالت کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر آواز اٹھتی ہے تو غیر مسلموں کے حق میں، کیونکہ اس پر ان کو مالی منفعت حاصل ہوتی ہے۔

ابھی تازہ واقعہ ہے کہ لاہور میں برسر بازار ایک امریکی نے تین پاکستانیوں کو گولیاں مار کر قتل کر دیا مگر ابھی تک کسی سول سوسائٹی کی طرف سے احتجاج دیکھنے میں نہیں آیا۔ آخر یہ پُر جفا سول سوسائٹی کہاں سے آتی ہے کہاں چلی جاتی ہے۔ کب آتی ہے اور کب چلی جاتی ہے۔ اس کے احساس کا پیمانہ کن کے لئے متعین ہے۔ یہ انسانیت کی سسکیوں پر چسکیاں کیوں بھرتی ہے۔

تاثیر کے قتل پر ہمارے ہاں کے سیکولر اور ترقی پسند طبقے کے وارے نیارے ہو گئے۔ ممتاز قادری کے چہرے پر چونکہ داڑھی تھی اس لئے شور مچایا جانے لگا کہ ہم نہ کہتے تھے کہ یہ داڑھی والے مذہبی لوگ دہشت گرد ہیں۔ یہ لوگ قاتل ہیں۔ حالانکہ ممتاز قادری کسی مدرسے سے نہیں پڑھا ہوا تھا، اس کی مذہبی تعلیم واجبی سی تھی، نعت خوانی کی حد تک اس کا اصرار تھا۔ البتہ ایٹ فورس میں ملازم تھا۔ چنانچہ اس محکمہ میں داڑھی والوں کی شامت آگئی، جتنے بھی باریش تھے ان کو ہٹا دیا گیا۔ ان کی جگہ بغیر داڑھی کے افراد کو لگا دیا گیا۔ اب خدا معلوم کہ ان بغیر داڑھی والوں کے دل میں بھی داڑھی ہے کہ نہیں۔

جبکہ دوسری طرف پورے ملک میں ایسی فضاء قائم ہو چکی ہے کہ لوگ ممتاز قادری جیسے کوہیرو کے طور پر دیکھنے لگے ہیں۔ وکلاء کے ایک طبقہ نے ممتاز قادری پر پھولوں کی پتیاں بھی نچھاور کی ہیں۔ عوام الناس



نے ممتاز قادری کے اس فعل پر منفی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس میں میڈیا کا کردار بڑا اہم ہے۔ اس لئے کہ میڈیا نے اس کو اتنا اچھالا تھا کہ اس کا انجام سامنے آ گیا۔ میڈیا نے باہر سے ڈالر کمانے کے لئے توہین رسالت کے قانون کو بدلنے کے لئے تحریک چلائی، ایک حساس موضوع کو زیر بحث لایا گیا، جو کہ دلائل و عقل کے بجائے عشق و ایمان کا معاملہ تھا۔ بڑے بڑے مفکر میڈیا پر آ کر اپنی اپنی عقلی خرافات پیش کرتے رہے۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ کی ذات کے معاملے میں ”جنون و عشق و محبت ہی کمالِ دانائی ہے“ کسی نے خوب کہا ہے کہ ”با خدا دیوانہ باشد با محمد ہو شیاز“۔ مگر ہمارے ہاں جب سے میڈیا آزاد ہوا ہے اس میں اس آزادی کا فائدہ خبروں، تجزیوں، تبصروں، مذاکروں، مباحثوں اور ٹاک شوز کا موضوع مذہب سے بے زاری، مذہب پر تنقید اور مذہبی راہنماؤں کی تحقیر کے علاوہ کچھ نہیں۔ آزادی رائے کے نام پر پہلے مسلمان اکابر کو زیر بحث لا کر ان پر تنقید کی جاتی ہے اور پھر توہین رسالت کے قانون کو رگیدا جاتا ہے۔ اور یہ کہہ کر کہ قرآن میں توہین رسالت کی کوئی سزا نہیں، توہین رسالت کرنے والے کے لئے آسانی پیدا کی جاتی ہے۔ پھر گرم گرم کھولتے ہوئے بیانات، گریبان پھاڑتے، علماء پر مغالطات بکتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ صرف مولویوں کا ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ پوری امت کے ایمان و ایقان کا مسئلہ ہے۔ اس حساس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس پر گفتگو کرتے ہوئے کتنے لوگوں کی جان جاسکتی ہے۔ انہیں نہ موضوع کی سنگینی کا احساس ہے اور نہ لوگوں کی جذباتی وابستگی کا۔

سلیمان تاثیر نے ایسے ہی ایک حساس موضوع ”سید الانبیاء ﷺ کی گستاخی کی سزا“ کو چھیڑا، اور میڈیا نے اس کو موضوع بحث بنا ڈالا۔ اور اس موضوع کو اقلیت کے خلاف ایک سازش قرار دیکر اسے کالا قانون قرار دیدیا۔ حالانکہ یہ موضوع نہ اقلیت کے خلاف ہے نہ اکثریت کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ اس کا تعلق تو صرف ایمانی کیفیت سے ہے۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمان جب اقلیت میں تھے تو اس وقت بھی انہوں نے اس مسئلے کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کیا تھا۔ غازی علم الدین شہید نے جس راجپال کو قتل کیا تھا وہ خود اس کتاب کا مصنف نہیں تھا، بلکہ وہ اس کا ناشر تھا۔ اگر وہ کتاب نہ شائع کرتا تو اس کتاب کا مصنف اپنی موت آپ مرجاتا اسے کوئی نہ جانتا۔ مگر کتاب شائع کرنے والا مارا گیا۔ اسی طرح سلیمان تاثیر عدالت کے فیصلے پر اعتراض نہ کرتا اور بڑی عدالت میں اپیل کر دیتا تو بڑی عدالت اگر ملزمہ کو چھوڑ دینے کا



فیصلہ بھی کر دیتی تو اس کا کسی کو علم بھی نہ ہوتا اور معاملہ ختم، ہو جاتا، اور ممتاز قادری کو ہتھیار اٹھانا نہ پڑتا۔

اس کا اصل قصور وار کون ہے؟ دانشوران قوم کا فرمان ہے کہ اس کے پیچھے تنگ نظر اور متشدد مذہبی پیشواؤں کی تقریروں کا اثر کارفرما ہے۔ یہ مولوی عدم برداشت کا ماحول پیدا کر رہے ہیں۔ آجکل دانشوران قوم تحمل اور برداشت کی نصیحت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرنے والوں کوں پڑھا رہے ہیں، جس پر ان محبت کرنے والوں کو اختیار نہیں۔

جس کے پاس جتنا اختیار تھا اس نے ویسا ہی کیا۔ یہ صرف اختیار ہی نہیں تھا بلکہ ردِ عمل تھا۔ مگر اس کو ردِ عمل ماننے کے لئے کوئی دانشور تیار ہی نہیں۔ ردِ عمل کے پیچھے ”عمل“ کو فراموش کر دینا ہی انار کی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ دانشور خود کتنے متحمل مزاج ہیں۔ ملک میں اسلامی نظام ان کو برداشت نہیں، حدود اللہ پر یہ لوگ نشتر چلانے سے باز نہیں آتے، مسیلمہ کذاب کی نسلوں کی وکالت کرتے ہوئے یہ لوگ تھکتے نہیں۔ ہر شخص نے ٹی وی پر اپنے فہم اسلام کی دکان کھولی ہوئی ہے، جہاں ضمیر اور آزادی اظہار کے نام پر اپنے ناجائز خمیر اور بددینی کو بیچا جا رہا ہے۔

چودہ سو برس کی علمی تحقیقات کو گلے پھاڑ کر ناقص اور کج فہمی کی سند عطا کی جا رہی ہے۔ جب یہ لوگ ٹی وی کیمرے کے آگے سے اٹھ کر مجلس آرائی کرتے ہیں تو بڑی رعونت کے ساتھ اپنی کارکردگی کا ذکر کرتے ہیں ”دیکھو سب کو خاموش کر دیا، مولوی کی تو ہمت ہی نہیں تھی کہ جواب دیتا، ہم سے زیادہ اسلام کو کون جانتا ہے، وہ جو کچھ ملاں کہہ رہا تھا وہ قرآن میں کہاں لکھا ہے، آخر ہم نے بھی تو قرآن پڑھا ہوا ہے، ہم نے ان ملاؤں کی طرح مدرسوں میں ہل ہل کر قرآن نہیں پڑھا بلکہ آرام سے لیٹ کر ریڈنگ کی ہے اور وہ بھی ترجمے کے ساتھ۔“

یہ سب کچھ کرنے کے بعد یہ دانشور کہتے ہیں کہ یہاں پر برداشت کا مادہ ختم ہو گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا ماحول پیدا کر کے تحمل کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ کیا یہ لوگ عقیدہ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی تعمیل کے بعد قرب الہی کے اس مقام تک پہنچ گئے ہیں کہ جہاں حجاب، داڑھی، شعائر اسلام اور عقائد و نظریات پر اپنی عادلانہ رائے دے سکیں۔ امت مسلمہ کے متفقہ فیصلوں کے ساتھ ناکارہ، آوارہ اور اوباش لوگوں کی چھیڑ خوانی اتنی بانجھ نہیں ہوتی کہ وہ شدت پسندی کو جنم نہ دے سکے۔

ہمارے عقائد و نظریات کا منبع ہی وہ ائمہ کرام ہیں جو کہ جناب نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ



کے قریب تھے۔ آجکل کے متجدد دین کی نقادانہ روش اور کیا رنگ لائے گی۔ یہ منکرین حدیث و قرآن جن باریکیوں کو بیان کر کے امت مسلمہ میں خلفشار پیدا کر رہے ہیں اس کا انجام یہی کچھ ہے جو سامنے آ رہا ہے۔ جس برداشت کی ضرورت مذہبی لوگوں کو ہے اسی برداشت کی ضرورت لبرل انتہا پسندوں کو ہے۔ ان لوگوں کو بھی ایک ضابطہ اخلاق بنانا ہوگا۔ ان کو اپنی ریسرچ کا رخ بدلنا ہوگا۔ سلیمان تاثیر لبرل فاسٹوں کی تالیوں میں جب توہین رسالت کے قانون کو کالاً قرار دے رہے تھے تو انہیں اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ وہ کس راہ پہ چل نکلے ہیں۔ ان کا یہ بے ڈھب رویہ مسلمانوں کے دلوں پر کیسے چر کے لگا رہا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے ناموس کے معاملے کو عمومی تصورات کی عینک سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے!

ادب گاہست زیر آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

رسول اللہ ﷺ کی عظمت و ناموس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جن کی بارگاہ ناز میں حضوری کے وقت جنید و بایزید جیسے اپنے حواس گنوا بیٹھتے ہیں۔ ان کے ناموس کو این جی او سٹائل میں بازاروں اور چوراہوں کا موضوع کیسے بنایا جاسکتا ہے۔

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب

ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبست

اپنے منہ اور زبان کو ہزار بار مشک اور گلاب سے دھونے کے باوجود رسول اکرم ﷺ کا نام مبارک ادا کرنا کمال درجے کی بے ادبی ہے۔ تاثیر کا انتہائی غیر محتاط اور گستاخی کی حدود چھوتے ہوئے طرز عمل کو کسی تاویل کے پردے میں نہیں لپیٹا جاسکتا۔ انہوں نے انتہائی ناتراشیدہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے کالاً قانون قرار دیا۔ اور پھر بعد میں وہ اور ان کے ہمنوایہ کہتے رہے اور کہہ رہے ہیں کہ یہ جنرل محمد ضیاء الحق شہید کا بنایا ہوا قانون ہے۔ حالانکہ یہ قانون جنرل محمد ضیاء الحق شہید کے دور میں بنایا ہی نہیں گیا۔ آئیے ہم اس کی حقیقت بھی واضح کئے دیتے ہیں۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ توہین رسالت کے سلسلہ میں جو قانون جنرل محمد ضیاء الحق شہید کے دور میں بنا اس میں اس کی سزا موت مقرر نہیں کی گئی تھی بلکہ عمر قید تھی۔ اور نہ ہی اس کے محرک جنرل محمد ضیاء الحق شہید تھے، بلکہ اس کے محرک پیپلز پارٹی کے اہم لوگ ہیں۔



واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۸۳ء میں لاہور میں ایک کتاب انگریزی زبان میں شائع ہوئی، جس کا نام Heavenly Communism (آفاقی اشتمالیت) تھا۔ اس کا مصنف مشتاق راج ایڈووکیٹ تھا۔ اس کتاب میں توہین رسالت کے پہلو نکلتے تھے۔ یہ کتاب انگریزی خواں طبقہ میں مفت تقسیم کی گئی۔ اس وقت لاہور بار ایسوسی ایشن کے صدر پیپلز پارٹی کے اہم رہنما جناب سید افضل حیدر تھے۔ ان کی صدارت میں لاہور بار ایسوسی ایشن کا اجلاس ہوا، جس میں مشتاق راج کی بار ایسوسی ایشن کی رکنیت ختم کر دی گئی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ کتاب کو ضبط کیا جائے اور مصنف کو گرفتار کر کے عبرت ناک سزا دی جائے۔ اسی اجلاس میں ایک قرارداد بھی پیش کی گئی کہ ملک میں توہین رسالت کی سزا موت مقرر کی جائے۔ کیونکہ اس وقت تک تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295/A میں توہین رسالت جیسے سنگین جرم کی سزائیں سال مقرر تھیں۔

یہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔ اس قرارداد کو پیش کرنے والے پیپلز پارٹی کے اہم رہنما پیر سٹر ملک سعید تھے۔ چنانچہ اس کے بعد ۱۹۸۵ء میں جنرل محمد ضیاء الحق شہید کے دور میں قائم ہونے والی اسمبلی میں دفعہ 295/A میں دفعہ 295/B کا اضافہ کر کے عمر قید کی سزا مقرر ہوئی۔ نوے عیسوی کی دہائی کے شروع میں سلمان رشدی کی طرف سے ”شیطانی آیات“ نامی کتاب لکھنے کی وجہ سے دنیا میں شور برپا ہوا۔ کیونکہ اس میں توہین رسالت کا ارتکاب کیا گیا تھا۔ ایران کے مذہبی رہنما خمینی صاحب نے سلمان رشدی کو مرتد اور واجب القتل قرار دیا اور ایرانی حکومت نے اس کے قتل پر دس لاکھ ڈالر انعام بھی مقرر کر دیا۔ پوری دنیا کی طرح پاکستان بھی مظاہروں کی لپیٹ میں آ گیا۔

جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ چل نکلا۔ یہاں تک کہ پیپلز پارٹی نے مولانا کوثر نیازی کی قیادت میں جلوس نکالا اور امریکن ایمپسی اسلام آباد کا گھیراؤ کر ڈالا، ایمپسی کو آگ لگائی گئی، اس میں توڑ پھوڑ کی گئی، جس کے جواب میں گولی چلائی گئی اور کچھ لوگ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے، اور امریکن ایمپسی نے مولانا کوثر نیازی کا ویزا بھی کینسل کر دیا۔ یاد رہے کہ اس وقت پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی، اور بے نظیر بھٹو وزیراعظم تھی۔

پھر اچانک بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی۔ نئے انتخابات کے بعد میاں محمد نواز شریف وزیراعظم بن گئے۔ پھر ۱۹۹۲ء میں جب کہ جنرل محمد ضیاء الحق کو شہید ہوئے تقریباً چار سال ہونے کو تھے۔ سلمان رشدی کی صدائے بازگشت ابھی سنائی دے رہی تھی، تو اس وقت کی پارلیمنٹ نے دفعہ 295/A/B میں



295/C کا اضافہ کر کے توہین رسالت کی سزا موت مقرر کر دی۔ اس قانون کو بنانے میں بے نظیر بھٹو اور موجودہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی بھی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ سزائے موت کا مطالبہ ملاؤں کے کسی اجلاس میں نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس اجلاس کی صدارت جنرل محمد ضیاء الحق شہید کا کوئی پیروکار کر رہا تھا۔ یہ ایک ماڈریٹ خیال کی حامل پیپلز پارٹی کے راہنما و کیلوں کی طرف سے تھا۔ مگر اب وہی پیپلز پارٹی اور لبرل دہشت گرد اپنے بیرونی آقاؤں سے مالی منفعت حاصل کرنے کے لئے ملک کو انارکی میں مبتلا کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

آجکل لبرل فاشٹ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کا بڑا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ ان لوگوں کا فرمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو کچھ بھی کہہ دیا جائے وہ اس لئے قابل معافی ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں اہانت کرنے والوں کو معاف کر دیا تھا، اس لئے کسی امتی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ توہین رسالت پر شدید رد عمل ظاہر کرے۔ اس میں ان چند واقعات کا سہارا لیا جاتا ہے جو کہ مکی زندگی میں پیش آئے۔ گویا کہ رسول اللہ ﷺ کی اہانت کرنے کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا۔

یہ بات یاد رکھیں کہ جن واقعات کو بیان کیا جاتا ہے وہ مکی زندگی کے ہیں، جب احکامات نازل نہیں ہوئے تھے، صرف تبلیغ و ترغیب کا دور تھا۔ یہ اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ دنیا کا نظام ہے کہ جب کسی تحریک کی ابتداء کی جاتی ہے اس میں انتہائی تحمل اور بردباری کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے، اور ہر ظلم و تشدد برداشت کرنا پڑتا ہے، تاکہ لوگوں کو اپنی بات نرمی کے ساتھ سمجھائی جاسکے۔ اور جب تحریک کامیاب ہو جاتی ہے تو اصول و قواعد جاری کر دیئے جاتے ہیں تاکہ کوئی اس تحریک کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس میں سب سے بڑی چیز آدمی کی عزت نفس کا خیال رکھا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر ملک میں کوئی پارٹی الیکشن کے لئے اپنا منشور لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہے تو اس کو پیش کرتے وقت نرمی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس میں اختلاف اور تشدد کو بھی برداشت کیا جاتا ہے۔ اور جب پارٹی کامیاب ہو کر حاکم بنتی ہے تو پھر اسی منشور کو نرمی کی بجائے حکم کے ذریعہ نافذ کیا جاتا ہے۔ اور حکم عدولی کی شکل میں سزا دی جاتی ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی کا دور اسلام کا ابتدائی دور تھا، اس میں احکام نازل نہیں ہوئے تھے، صرف نماز کی فرضیت نازل ہوئی تھی، وہ بھی مکی زندگی کے آخری سالوں میں، باقی تمام احکام مدینہ میں



نازل ہوئے، اس لئے مکی زندگی میں ہر قسم کی سختی اور توہین برداشت کی گئی۔ مگر جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی گئی تو احکام نازل ہونا شروع ہو گئے، بلکہ ان کا نفاذ بھی ساتھ ساتھ کیا گیا۔ مکی زندگی میں رسول اللہ ﷺ سمیت تمام صحابہؓ پر ظلم ہوتے رہے مگر سب نے صبر کا دامن تھامے رکھا اور آنے والی اچھے وقت کا انتظار کرتے رہے۔ جب مدنی دور آیا تو مسلمانوں نے طاقت پکڑنا شروع کر دی۔

اب چہ جائے کہ کوئی مسلمانوں پر ظلم کرتا اب مسلمانوں نے خود انہی ظلم کرنے والوں کے نہ صرف راستے روکے بلکہ آگے بڑھ کر ان ظالموں پر حملہ آور ہوئے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس پیش پیش تھی۔ جنگ بدر اس کی واضح مثال ہے۔ یہ جنگ خود رسول اللہ ﷺ نے شروع فرمائی۔ اسی طرح سے مکی زندگی میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اخلاق عالی سے درگزر فرمایا، مگر مدنی زندگی میں جب رسول اللہ ﷺ نے حکومت قائم فرمائی تو اللہ نے جہاں اور احکام نازل فرمائے وہاں پر رسول اللہ ﷺ کے احترام کو سب سے زیادہ مقدم رکھا۔ اس کے متعلق احکام نازل فرمائے، اس پر متعدد آیات قرآنی موجود ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کا اپنا طرز عمل واضح ہے کہ مدینہ میں توہین رسالت کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ ان کو کس طرح قتل کیا گیا، فتح مکہ میں بھی توہین کرنے والوں کو زندہ نہیں چھوڑا گیا۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کا معاملہ ان کی اپنی ذات تک محدود تھا اللہ نے بھی اس پر زور نہیں دیا۔ البتہ اپنے رسول اللہ ﷺ کی امداد کا بھرپور بندوبست کیا۔ جیسے کہ طائف کا واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ طائف والوں کو سزا دینے کا اظہار فرمایا تو رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر اس سزا کو ٹال دیا کہ یہ لوگ مجھے جانتے نہیں، جب جان جائیں گے تو یہ لوگ خود مسلمان ہو جائیں گے۔ مگر جب مدنی دور آیا تو تمام لوگ جان گئے تھے، نیز اب صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات کا مسئلہ نہیں رہ گیا تھا اب اللہ کے قانون کے نفاذ کا معاملہ بھی آ گیا تھا۔ اور اللہ کا قانون جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات اقدس کے ذریعہ ہی سے نافذ ہونا تھا، اس لئے اللہ نے جہاں پر اور احکام نازل فرمائے وہاں پر رسول اللہ ﷺ کی توہین کرنے والوں پر بھی سزا کے احکام بھیجے، اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو نافذ بھی فرمایا۔

جب تک رسول اللہ ﷺ کی اپنی مرضی کا معاملہ رہا، اللہ نے بھی ان پر زور نہیں دیا، اور رسول اللہ ﷺ اس پر درگزر کرتے رہے۔ مگر جب اللہ نے حکم دیدیا تو توہین رسالت کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی طرف



سے معافی کا اختیار ختم ہو گیا۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے احکام کو رد فرمادیں۔ کیونکہ قرآن میں خود اللہ کا فرمان ہے، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ وہی کہتے ہیں جس کی ان کو وحی کی جاتی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتے بلکہ وہی کچھ کرتے ہیں جن کی ان کو وحی کی جاتی ہے۔

اب یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ اس قانون کو غلط استعمال کرنے پر بھی گرفت ہونی چاہیے۔ لبرل فاشٹ تو اس آڑ میں قانون کو ہی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت نے ان کے زور دینے پر ایک عیسائی کو جو کہ توہین رسالت کے قانون کا مخالف ہے اس کمیٹی کا سربراہ بنا دیا جو کہ اس قانون کا جائزہ لے۔ اس لئے ان کی بات پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔

مگر کچھ سنجیدہ حلقے بھی اس سلسلہ میں متفکر ہیں۔ ان مخلص حضرات کی تشویش بھی بجا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ملک کا کلچر ہی ایک دوسرے کی دشمنی میں پروان چڑھا ہے۔ جہاں پر عدالتوں اور کچہریوں میں کرائے کے گواہ مل جائیں، جہاں محض دشمنی کی بنیاد پر کئی کئی سال لوگ جیلوں میں بند رہیں، بلکہ اکثر مقدمات ہی اسی قسم کے ہوتے ہیں، وہاں پر کیا کیا جائے۔

کیا غلط اطلاع دینے والے کو سزا نہ دی جائے۔ اس سلسلہ میری ناقص رائے یہ ہے کہ نہ صرف توہین رسالت کے معاملے میں جھوٹی درخواست دینے والے کی گرفت کی جائے بلکہ اس سلسلہ میں ہر مقدمہ کے لئے جھوٹی درخواست دینے والے کے لئے سزا مقرر کی جائے۔ مگر اس سلسلہ میں احتیاط کا پہلو اس شکل میں رکھا جائے کہ اہل علم یہ فیصلہ کریں کہ کسی کا کوئی قول یا عمل توہین رسالت کے زمرہ میں آتا بھی ہے یا نہیں۔ جیسے کئی واقعات ایسے ملتے ہیں، کسی کے نام کے ساتھ لفظ محمد لکھا ہوا ہے اور کاغذ کا وہ پرزہ زمین پر گر گیا تو کہہ دیا گیا کہ توہین رسالت کر دی گئی۔ یا کسی دیوار پر اشتہار کی شکل میں لفظ محمد لکھا گیا، جب سفیدی کر کے اس دیوار کو صاف کیا گیا جس میں لفظ محمد بھی آ گیا تو کہہ دیا گیا کہ توہین رسالت کر دی۔ اسی طرح اگر کسی میلاد کے اشتہار یا بینر کو اتار دیا گیا تو بھی اس کے خلاف توہین رسالت کی مقدمہ درج کر دیا گیا۔ یا جیسے آجکل بغیر پوچھے یا انتظامیہ نے بغیر سوچے سمجھے کچھ فرقہ پرستوں کے زور دینے پر صلوٰۃ و سلام کا بورڈ لگا دیا بعد میں اگر کسی انتظامی افسر نے فرقہ وارانہ اختلافات سے بچنے کے لئے اس بورڈ کو ہٹا دیا تو اس پر بھی توہین رسالت کا الزام لگا دیا گیا۔



اسی طرح آجکل فرقہ وارانہ اختلافات میں تحقیقی رائے کو بھی بعض اوقات توہین رسالت قرار دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں علمی معاملات میں اکثر وہ لوگ فیصلے کرتے ہیں جو کہ اس معاملے میں ناواقف ہوتے ہیں۔ یا بعض لوگ قانون کو بدنام کرنے یا اس کو مسخ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ تاکہ عوام الناس اس قانون سے بے زار ہو جائیں۔

جیسے کہ جنرل محمد ضیاء الحق شہید کے دور میں جب حدود آرڈینینس جاری کیا گیا۔ تو پولیس والوں نے راہ گیر میاں بیوی سے ان کا نکاح نامہ طلب کرنا شروع کر دیا۔ بغیر کسی تحقیق کے حدود کے مقدمے درج کر دیئے، اور رشوت کا بازار گرم کر ڈالا۔ جس کا نتیجہ پریشانی اور بدنامی کے علاوہ کچھ نہیں نکلا۔

کہا جاتا ہے کہ توہین رسالت کے مقدمے میں ایف، آئی، آر کسی بڑے افسر کی سفارش پر درج کی جائے۔ یہ بھی غلط ہے۔ ایف، آئی، آر، کوئی فیصلہ کن تحریر نہیں ہے۔ یہ تو انگریزی میں فرسٹ انفرمیشن رپورٹ (یعنی پہلی اطلاعی تحریر) ہے۔ اس کو نہ چھیڑا جائے، ورنہ ہر مقدمہ والا یہی مطالبہ کرے گا۔ البتہ ایف، آئی، آر درج کرنے کے بعد اہل علم کی ایک مجلس میں پیش کر دیا جائے اور ان سے رائے لی جائے کہ یہ توہین رسالت کا ارتکاب بنتا ہے یا نہیں۔ اس لئے توہین رسالت کے ارتکاب کے کچھ اصول بھی طے کئے جائیں۔ اس کے لئے معتدل مزاج اہل علم کا انتخاب کیا جائے۔

دانشمندی کا تقاضا ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھے جائیں، ہمارا ملک اس بات کا متحمل نہیں ہے کہ نئے نئے کھیل کھیلے جائیں، اور ملک عالمی دہشت گردی کی جلائی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے۔ ہر شخص اور گروہ اپنے انداز فکر کا ناقدانہ جائزہ لے۔ اگر ممتاز قادری نے قانون اپنے ہاتھ میں لیا تھا تو سلیمان تاثیر نے بھی قانون کو ہی اپنے ہاتھ لے کر ممتاز قادری کو یہ راہ دکھائی، جس کا نتیجہ سامنے ہے۔ فارن فنڈ ڈائن جی اوز گستانی رسول جیسے فتنج جرم کو قابل برداشت بنانے کے لئے اگر یہی کچھ کرتی رہیں تو اس ملک میں انار کی مزید پھیلے گی، اور اگر اس سلسلہ کو نہ روکا گیا تو ہر پاکستانی اس شعر کا مصداق بن جائے گا۔

نماز اچھی ، روزہ اچھا ، زکوٰۃ اچھی  
مگر میں باوجود اس کے مسلمان ہو نہیں سکتا  
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ بطحاؒ کی عزت پر  
خدا شاہد ہے کامل میرا ایمان ہو نہیں سکتا



# تحریک ختم نبوت تاریخ کے آئینے میں

قسط ۱۲

ابنیں حبیب الرحمن لدھیانوی

## فتنہ قادیانیت کا پس منظر

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریز کی عملداری ۱۷۵۷ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب پلاسی کی جنگ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں نے نواب سراج الدولہ کو شکست دی اور آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قبضہ جمالیا، اور شاہی سلطنت انگریز کی ملازم کی حیثیت اختیار کر گئی اور ملک کا نظم و نسق انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے چلانا شروع کر دیا۔

انگریزی سامراج کے خلاف ہندوستان میں اندرون خانہ زبردست قومی تحریک شروع تھی اور یہ تحریک انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں شروع ہوئی۔ انگریز نے آتے ہوئے ایسی چالاکی سے ہندوستان میں قدم رکھا کہ ہندوستان کی قوم اس کی چالاکی کو سمجھ نہ سکی۔ اور ہوش اس وقت آیا جب انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کی تمام قوموں نے مجتمع ہو کر جن میں مسلمان قوم سب سے زیادہ پیش پیش تھی انگریز کے خلاف ۱۸۵۷ء میں علم بغاوت بلند کر دیا۔

لیکن یہ انقلاب وقتی طور پر ناکام ہو گیا۔ اس انقلاب سے پہلے انگریز یہی سمجھتا تھا کہ اب اس کے لئے برصغیر میں حکومت کرنے میں کوئی دشواری نہیں رہی۔ لیکن جب انگریز نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا نقشہ دیکھا تو اس کو اپنی سوچ بدلنا پڑی اور اس انقلاب کی جب تحقیق کی تو سب سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ انگریز کی مخالفت کرنے میں مسلمان قوم پیش پیش تھی۔ جب مسلمان قوم کے مذہب کا مطالعہ کیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس قوم کو اتنی جلدی غلام بنانا آسان نہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں نے انگریزی تسلط کو انقلاب کی ناکامی کے بعد فی الفور تسلیم کر لیا تھا۔

جبکہ مسلمان قوم اس کے ظلم و ستم کا شکار ہوئی۔ ہزاروں علماء شہید کر دیئے گئے۔ گھروں کو اُجاڑ دیا گیا۔ سینکڑوں ہجرت کر گئے۔ مختصر یہ کہ انگریز نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا جینا دو بھر کر دیا



تھا، لیکن ان تمام مظالم کے باوجود بھی مسلمان قوم کے اندر وہی جوش و جذبہ موجود تھا۔ انگریز مسلمان قوم کی فطری خاصیت سے واقف ہو گیا تھا کہ مسلمان مذہب کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہے، چاہے اسے اپنی جان سے بھی کیوں نہ ہاتھ دھونے پڑیں۔

یہ سبق اسلام نے مسلمان قوم کو دیا تھا جو کہ جذبہ جہاد کے نام سے موسوم ہے۔ انگریز نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح مسلمان قوم کے دل سے یہ جذبہ جہاد نکال دیا جائے اور یہ کام اس وقت ہی ہو سکتا تھا جب کہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو پارہ پارہ کیا جائے، کیونکہ جب تک مسلمان قوم میں اتحاد باقی ہے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ اس کام کے لئے انگریز نے مسلمان قوم میں سے چند ایسے افراد کو چنا جو کہ اس کام کو احسن طریقے سے انجام دے سکتے تھے۔ ان میں سر سید احمد خاں، مرزا غلام احمد قادیانی قابل ذکر ہیں۔ سر سید احمد خاں نے انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو انگریز کی غلامی کا سبق پڑھایا۔ بعض تعلیم یافتہ لوگ علماء کی اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ انہوں نے سر سید احمد کی مخالفت کی اور نئی تعلیم کے مخالف تھے۔

یہ بات ذہن میں رکھنا غلط ہے کہ انگریزی تعلیم علماء کے نزدیک مسلمان قوم کے لئے مضر تھی۔ جن لوگوں نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی وہ صرف انگریز کی طرز تعلیم کے مخالف تھے جس میں غلامی کی تعلیم دی جاتی تھی ورنہ جدید تعلیم کا کوئی بھی مخالف نہ تھا۔

دوسرا شخص مرزا غلام احمد قادیانی تھا، جس کے ذریعہ انگریز نے مسلمان قوم کے دل سے جذبہ جہاد مٹانا تھا اور وہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کسی نئی نبوت کا انتظام نہ کیا جاتا۔

## انگریز کی طرف سے خصوصی کمیشن کا قیام

چنانچہ انگریزوں نے ایک کمیشن بٹھایا کہ وہ ان باتوں کا جائزہ لے۔

۱: کہ ہم نے حکومت تو مسلمانوں سے چھینی تھی لیکن اس کے دوبارہ حاصل کرنے

میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ کیوں دیا۔

۲: ہندو مذہب میں جہاد کا وجود نہیں جبکہ اسلام کا یہ ایک اہم جزو ہے۔ پھر جہاد کے

عنوان سے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ہندو کیوں شریک ہوا۔



۳: ہندو اور مسلمان کی تہذیب میں بھی اختلاف ہے، پھر یہ اتحاد کیسا۔

۴: اگر اس کے محرکات محض انگریز دشمنی پر مبنی ہیں تو پھر انگریز قوم کو بھی سوچنا پڑے گا، ورنہ ہندوستان میں اس کا مستقبل روشن نہیں۔

فرنگی دانشوروں کی یہ سوچ برطانوی سیاستدانوں کی میز سے ایوان حکومت تک پہنچی اس بنیاد پر ۱۸۶۹ء کو انگریز نے ایک کمیشن ہندوستان بھیجا کہ وہ انگریز کے خلاف خصوصاً مسلمانوں کا مزاج معلوم کرے۔ نیز آئندہ کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کو رام کرنے کی تجاویز مرتب کرے۔

اس کمیشن نے ایک سال ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کے حالات معلوم کئے اور واپسی پر ۱۸۷۰ء کو لندن میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں کمیشن مذکور کے نمائندوں کے علاوہ ہندوستان میں متعین عیسائی مشنری کے پادری بھی اس خاص دعوت میں شریک ہوئے۔ کمیشن کے نمائندوں اور پادریوں نے اپنی اپنی رپورٹیں پیش کیں۔

### کمیشن کے سربراہ ولیم ہنٹر کی رپورٹ:

مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ وہ کسی غیر ملکی حکومت کے زیر سایہ نہیں رہ سکتے اور ان کے لئے غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے۔ اس تصور سے مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ ہے وہ جہاد کے لئے ہر لمحہ تیار رہتے ہیں۔ ان کی کیفیت کسی وقت بھی انہیں غیر ملکی حکومت کے خلاف ابھار سکتی ہے۔

### پادری صاحبان کی رپورٹ

یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اس وقت ہم کسی ایسے غدار کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں جو ظلی نبوت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہو جائے تو اس کے حلقہ نبوت میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہو جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں میں سے اس قسم کے دعویٰ کے لئے کسی کو تیار کرنا بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل کام اگر حل ہو جائے تو اس شخص کی نبوت کو حکومت کے زیر سایہ پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔

ہم اس سے پہلے برصغیر کی تمام حکومتوں کو غدار تلاش کرنے کی حکمت عملی سے



شکست دے چکے ہیں۔ لیکن وہ مرحلہ اور تھا کیونکہ اس وقت فوجی نقطہ نظر سے غداروں کی تلاش کی گئی تھی۔ مگر اب جبکہ ہم برصغیر کے چپہ چپہ پر حکمران ہو چکے ہیں اور ہر طرف امن و امان بھی بحال ہو گیا ہے۔ تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبہ پر عمل کرنا چاہئے جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔

### اقتباس

مطبوعہ رپورٹ کانفرنس لندن منعقدہ ۱۷-۱۸

(دی ارا نیول آف برٹش ایمپائر آف انڈیا)

انہی دنوں برطانوی پارلیمنٹ میں وزیراعظم انگلستان مسٹر گلڈسٹون نے تقریر کے دوران قرآن کریم ہاتھ میں لے کر کہا کہ جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے ہم اطمینان سے حکومت نہیں کر سکتے۔ یہ فقرہ کہتے ہوئے وزیراعظم برطانیہ نے کلام الہی کو زمین پر دے مارا۔ ایک اجلاس میں لارڈ میکالے وزیر ہند نے کہا تھا کہ میری تجویز ہے:

”ہندوستان میں ایسی تعلیم رائج کی جائے جس کے ذریعے ہر ہندوستانی لباس، بول چال، رہن سہن اور طرز تمدن میں انگریز معلوم ہونے لگے۔ چاہے وہ عیسائی نہ بھی ہو مگر زندگی کے ہر شعبہ میں انگریز دکھائی دے“

ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں سے چھینی گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ بھی مسلمان علماء نے دیا تھا۔ نیز مسلمانوں نے بہادر شاہ ظفر مرحوم کو دہلی کے تخت پر دوبارہ بٹھانے کے لئے ہندوؤں کو ساتھ ملا کر انہیں مسلح بغاوت پر آمادہ کیا۔ ان حالات میں انگریز کے نزدیک اصل مجرم مسلمان تھا اور آئندہ بھی برطانوی راج کو ہندوستان میں اگر کوئی خدشہ ہو سکتا تھا تو وہ بھی مسلمانوں سے۔ ان حالات میں لندن کے مجوزہ فیصلے اور وزیراعظم برطانیہ کی رائے اور لارڈ میکالے کی تجاویز کا زیادہ وزن ہندی مسلمانوں پر ڈالا گیا۔

لارڈ میکالے اور ہندوستانی پادریوں کی تجویز کے تحت ہندوستان سے ایسے آدمیوں کی تلاش ہونے لگی جن کے ذریعہ ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں سے ۱۸۵۷ء کے جذبات کا خاتمہ ہو سکے اور جذبہ جہاد کو بھی ختم کیا جاسکے۔ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے انگریز کی نظر انتخاب دو اشخاص پر پڑی۔ یعنی سر سید احمد خان اور مرزا غلام احمد قادیانی۔

سر سید احمد خان کا سیاسی نظریہ



سر سید نے ۱۸۷۱ء میں انگلستان سے واپس لوٹے، یاد رہے یہی وہ سال ہے جب کہ لندن میں وہ کانفرنس ہو رہی تھی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، تو انہوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تگ و دو شروع کر دی تھی۔ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کا قیام اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ اس کی تجاویز کے مطابق محمدن کالج فنڈ کمیٹی کی تشکیل کی گئی جو مجوزہ کالج کیلئے چندہ کی فراہمی کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی تھی۔

حکومت ہند نے، جسے اس فیصلے کی اطلاع دی گئی تھی اس تجویز کو بہت پسند کیا اور لکھا کہ شمال مغربی اضلاع کے مسلمانوں کی یہ تجویز اس بات کی مستحق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت اس میں مدد دے۔ لارڈ نارٹھ بروک وائسرائے ہند نے اپنی جیب سے دس ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۷۳ء میں مدرسہ کی سکیم مکمل کر لی گئی۔ مولوی سمیع اللہ خاں کے زیر انتظام اس مدرسہ کا افتتاح ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو سر ولیم مور کے ہاتھوں ہوا۔ محمدن کالج فنڈ کے سیکرٹری کو چندہ جمع کرنے میں کافی کامیابی ہوئی۔ نظام حیدر آباد نے نوے ہزار روپے دیئے اور چھ ہزار روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ کیا۔

مہاراجہ پٹیالہ نے اٹھاون ہزار روپیہ دیا۔ (اگر یہ تعلیمی سکیم صرف مسلمانوں کی ترقی کیلئے تھی تو مہاراجہ پٹیالہ نے اٹھاون ہزار کیوں دیا۔ اسی سے شبہ ہوتا ہے کہ تعلیمی ترقی کی سکیم میں انگریز کی نیت نیک نہیں تھی) نواب آف رام پور نے بھی بہت مدد کی۔ حکومت نے بیالیس سو روپیہ سالانہ گرانٹ منظور کی، بعد میں اضافہ کر دیا گیا اور گرانٹ بارہ ہزار روپیہ سالانہ مقرر کی گئی۔ الغرض اتنا چندہ جمع ہو گیا تھا کہ کالج کا آغاز کیا جاسکے۔ چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو ایم او کالج علی گڑھ کا افتتاح لارڈ لٹن کے ہاتھوں ہوا۔

(تاریخ پاکستان - ص ۱۸۶)

سر سید احمد خاں علی گڑھ کالج کی مجلس منتظمہ کے سیکرٹری تھے، انہوں نے کالج میں بیشتر سٹاف یورپین رکھا تھا۔ کالج کا پرنسپل بھی انگریز ہی ہوا کرتا تھا۔ یہ بات بعض مخلص مسلمان سربراہوں کی نظر میں قابل اعتراض تھی۔ وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یورپین عیسائی مسلمانوں کو صحیح تربیت کیسے کر سکیں گے۔ بالخصوص پرنسپل بیک Back کی سرگرمیاں سر سید کے رفقاء کار کو قطعی ناپسند تھیں۔ چنانچہ جب ایک انگریز پروفیسر کو ہوٹل کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا تو اس کی خلاف شدید احتجاج ہوا۔



سر سید انگریزوں کی علمیت سے متاثر تھے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ یورپین سٹاف علی گڑھ اور حکومت کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لئے وہ ہر قیمت پر یورپین سٹاف کو راضی رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔

(تاریخ پاکستان ص ۱۸۷)

قانون کی نظر میں مساوات کے مطالبے کے علاوہ معاشرتی انصاف پر بھی سر سید نے زور دیا اور اس کے لئے اپنی قوم (مسلمان) کو انگریز کے طور طریقے اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔

(تاریخ پاکستان ص ۱۹۰)

برصغیر کا یہ ہونہار سپوت (سر سید احمد) ۱۷- اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوا۔ یہ حسینی سید تھے۔ جوانی کے ابتدائی ایام تھے اور ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی تمام ذمہ داری ان پر آن پڑی۔ یہ چاہتے تو مغل دربار میں اچھی ملازمت مل سکتی تھی لیکن ان کی رائے میں ملک کی مضبوط ترین حکومت انگریز کمپنی کی ہے اور یہی آخر کار قائم رہنے والی ہے۔ لہذا، انہوں نے کمپنی کی ملازمت کو ترجیح دی۔

۱۸۳۹ء میں سر سید کو کمپنی کی ملازمت میں سرشتے دار کی معمولی آسامی ملی۔ ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کر لیا اور ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک دہلی میں منصف کے عہدے پر نامزد رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ حریت میں انگریزوں کی جانیں بچانے کے سلسلے میں آپ کو ۱۸۶۲ء میں صدر الصدور بنادیا گیا، ۱۸۶۹ء کو سر سید کے لڑکے سید محمود کو انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ ملا تو آپ ان کے ساتھ انگلستان چلے گئے (انگلستان میں قیام کے دوران سر سید احمد کو دو سو پچپن پونڈ سالانہ وظیفہ ملتا رہا)

(”مذہب اسلام“ مصنف محمد نجم الحسن رامپوری ص ۶۴۳)

۱۸۷۷ء میں دو سال کے لئے سر سید کو امپیریل کونسل کا رکن نامزد کیا گیا ۱۸۸۸ء میں سر سید کو حکومت برطانیہ کی طرف سے سر کا خطاب ملا۔

اس طرح زندگی کے خوبصورت دن گزار کر سر سید احمد ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔



(اقتباسات تاریخ پاکستان مطبوعہ سٹینڈرڈ بک ہاؤس اردو بازار لاہور)

## سرسید کے مذہبی عقائد

سرسید احمد کے سیاسی افکار جاننے کے بعد ان کے مذہبی عقائد کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ قارئین کو سرسید کی دونوں حیثیتیں جان کر ان کے متعلق فیصلہ دینے میں آسانی ہو۔

۱:- نبوت: یہ ایک ملکہ (تجربہ) ہے جو انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے جیسے طب، شاعری وغیرہ۔ اور جبرائیل علیہ السلام کا کوئی خارجی وجود نہیں بلکہ وہ اسی کیفیت اور ملکہ کا نام ہے۔

(تفسیر القرآن جلد اول ص ۲۶ تا ۳۱ مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ)

۲:- جنت اور دوزخ کے خارجی وجود سے انکار۔

(تفسیر القرآن جلد اول ص ۳۵)

۳:- فرشتوں اور جنوں کے وجود کا انکار۔

(تفسیر القرآن جلد اول ص ۴۶)

۴:- موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار۔

(تفسیر القرآن جلد اول ص ۱۰۰ تا ۱۱۵)

۵:- ابراہیم علیہ السلام نے بھی بت پرستوں کی طرح عبادت کے لئے پتھروں کا ایک گھر کھڑا کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز کا حکم نہیں دیا۔

(تفسیر القرآن جلد اول ص ۱۷۶ تا ۱۸۶)

۶:- عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ پیدا ہونے، ماں کی گود میں کلام کرنے اور زندہ

آسمان پر اٹھائے جانے سے انکار۔

(تفسیر القرآن جلد دوم ص ۱۲ تا ۲۲ مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ)

۷:- آنحضرت ﷺ کی معراج جسمانی کا انکار۔

(تفسیر القرآن ج ششم ص ۷۵ مطبوعہ اسٹیورٹ پریس علی گڑھ)

نوٹ: مندرجہ بالا حوالہ جات سرسید احمد کی کتاب تفسیر القرآن سے ماخوذ ہیں۔

مشہور مؤرخ اسلام مولانا نجم الغنی رامپوریؒ اپنی کتاب مذہب اسلام کے صفحہ ۶۴۳ پر سرسید کے



متعلق لکھتے ہیں:

راجہ رام موہن رائے ایک بنگالی ہندو نے اسلام اور پادریوں کی کتب سے واقف ہو کر ایک نئے مذہب برہموسماج کی بنیاد رکھی۔ سرسید نے کلکتہ میں جب ان سے ملاقات کی اور برہموسماج مذہب کو ہونہار دیکھا اور اس کے اصولوں کو یورپ کے فلاسفروں اور ایشیا کے معلموں کے مطابق خیال پا کر اسکو از حد پسند کیا اور دل میں جو مراد تھی، اس کو بلا محنت و مشقت پایا۔ لیکن وہ کھلم کھلا اسلام کو ترک کر کے ایک بنگالی بابو کے مرید اور امتی کہلاتے رہے۔

پس دل میں یہ سوچ کر کہ برائے نام تو اسلام ہو مگر اس کو برہموسماج مذہب کے مطابق کیجئے۔ لفظ نبی، ملائکہ، جبرائیل، جنت اور دوزخ، وحی والہام، شیطان بلکہ آسمان و جن کو تو بحال رہنے دیجئے اور ہر مسلمان سے کہیے کہ میں ان چیزوں پر ایمان رکھتا ہوں تاکہ مسلمانوں کو مجال تکفیر نہ ہو اور ان الفاظ کے معنی بالکل پلٹ دیجئے۔

سرسید کہتے ہیں کہ نبوت ایک فطری ملکہ ہوتا ہے (تہذیب و اخلاق مصنفہ سرسید احمد خاں) اور جس شخص میں جس فن کا ملکہ بدرجہ کمال ہوتا ہے وہ اسی فن کا امام یا پیغمبر ہے۔ لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ شاعر بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے۔

ایک طبیب بھی فن طب کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ مگر جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہے اور جس میں اخلاق انسانی کی تعلیم و تربیت کا ملکہ ہو، بمطابق اس کی فطرت کے، خدا سے عنایت ہوتا ہے۔ وہ پیغمبر کہلاتا ہے۔ خدا اور پیغمبر میں بجز اس ملکہ نبوت کے جس کو ناموس اکبر کہتے ہیں اور زبان شرعی میں جبرائیل کہتے ہیں اور کوئی جسم ایچی یا پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا۔ خود اس کے دل سے فوارے کی مانند وحی اٹھتی ہے اور خود اس پر نازل ہوتی ہے۔ وہ اپنا کلام نفس ان ظاہری کانوں سے اس طرح پر سنتا ہے جیسے کوئی دوسرا شخص اس سے کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ظاہری آنکھوں سے اس طرح پر دیکھتا ہے جیسے دوسرا شخص اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔



(مذہب اسلام صفحہ ۶۴۴ مصنفہ مولانا نجم الغنی رامپوری)

سر سید اپنی کتاب تہیین الکلام کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

میں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کو باہم ملانا اور ایک بنانا چاہا۔ مگر اس میں

نا کام رہا۔

(بحوالہ کاروان احرار جلد اول)

## عقیدہ وفاتِ مسیح میں سر سید احمد خان مرزا قادیانی کا استاد

سر سید احمد خان نے چونکہ نیچری مذہب اختیار کر لیا تھا چنانچہ اس مذہب کے مطابق ہندوستان میں سر سید پہلے شخص ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمانوں پر اٹھائے جانے سے انکار کیا (جو کہ مسلمانوں کا ایک اجماعی عقیدہ ہے) اور اس کے ساتھ ساتھ سر سید احمد خان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدائش سے بھی انکار کیا پھر انہی عقائد کو مرزا غلام احمد قادیانی نے اختیار کر لیا۔

چنانچہ اس موضوع پر مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری لکھتے ہیں:

میں کتاب ”آئمہ تلپیس“ میں ”مرزائیت کے مآخذ اور اصول مذہب“ کے عنوان سے لکھ آیا ہوں کہ مرزا غلام احمد نے یہود، نصاریٰ، آریہ دھرم، مشبہ، فلاسفہ، اہل نجوم، باطنی فرقہ، مہدویہ، بابیہ، بہائیہ، اور نیچریہ کے کون کون سے اصول و عقائد اپنے مسلک میں داخل کئے؟ جن ملحدانہ مسائل میں الہامی صاحب نے نیچری مذہب کے بانی سر سید احمد خان علی گڑھی کی شاگردی اختیار کی، ان میں ایک مسئلہ وفاتِ مسیح علیہ السلام بھی ہے۔ سر سید ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے وفاتِ مسیح علیہ السلام کی رٹ لگائی تھی۔ جو حضرات اسکی تفصیل دیکھنا چاہیں، وہ آئمہ تلپیس (صفحہ ۵۰۶، ۵۱۲) کا مطالعہ فرمائیں۔

## الفضل کا اعتراف

خود مرزائی جریدہ الفضل قادیاں کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ سب سے پہلے سر سید نے وفاتِ مسیح کا اعلان کیا۔ چنانچہ ”الفضل“ نے ۲۰ مئی ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں لکھا۔ ”بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت مسیح موعود نے آ کر کوئی ایسا کام نہیں کیا جس



سے ان کی صداقت ثابت ہو سکے۔ جو کچھ انہوں نے کیا ہے، ان سے پہلے سرسید وہی کچھ کر گئے ہیں۔ اس لئے مرزا صاحب کے دعاوی کو قبول کرنے کی ہمیں کیا ضرورت ہے اور ہم کیوں کریں۔ اس کے متعلق میں صرف یہی کہوں گا کہ اگر ایسے لوگ آنکھیں، کان اور دل رکھتے تو اپنے لئے کبھی یہ فیصلہ نہ کرتے۔

سب سے بڑا مسئلہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح موعود نے سرسید کی تقلید میں بیان کیا ہے وہ وفات مسیح کا مسئلہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے سرسید نے اس کا اعلان کیا اور بعد میں مرزا صاحب نے اسی کو پیش کر دیا۔ لیکن اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سرسید نے جس رنگ اور جس طرز سے اس مسئلہ کا اقرار کیا ہے، اس میں اور جس رنگ میں حضرت مسیح موعود نے اسکو صاف کیا ہے اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

الفضل نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے مجھے حرف بحرف اتفاق ہے۔ گو سرسید نے اپنے زورِ قلم سے مسیح علیہ السلام کو زمرہ اموات میں داخل کیا، لیکن ان سے یہ کوتاہی ہوئی کہ مسیح علیہ السلام کی جان ستانی کے بعد آپ کو یوں ہی بے گور و کفن چھوڑے رکھا۔ آخر کئی سال کے بعد شاگرد نے عزم بالجزم کیا کہ جس کام کو استاد نے ادھورا چھوڑ دیا ہے، اس کی تکمیل کی جائے۔ چنانچہ قادیانی صاحب نے حضرت مسیح علیہ السلام کا مرقد تجویز کرنے کے لئے بھی جہاں گردی شروع کی۔ پہلے تو انہیں گلیل میں دفن کیا۔ (ازالہ اوہام، طبع پنجم، صفحہ ۱۹۷)

پھر پونے تین سال کے بعد اس کی نعش اطہر کو وہاں سے نکال کر طرابلس کے حدود میں دفن کیا، چنانچہ لکھا کہ حضرت عیسیٰ کی قبر بلادِ شام میں موجود ہے اور ہم زیادہ صفائی کے لئے اس جگہ حاشیہ میں اخویم محبی فی اللہ مولوی محمد السعیدی طرابلسی کی شہادت درج کرتے ہیں اور وہ طرابلس بلادِ شام کے رہنے والے ہیں اور انہی کی حدود میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر ہے اور اگر کہو کہ وہ قبر جعلی ہے تو اس جعل کا ثبوت دینا چاہئے اور ثابت کرنا چاہئے کہ کس وقت یہ جعل بنایا گیا ہے اور اس وقت دوسرے انبیاء کی قبروں کی نسبت بھی تسلی نہیں رہے گی اور ایمان اٹھ جائے گا اور کہنا پڑیگا کہ شاید وہ تمام قبریں جعلی ہی ہوں۔



(اتمام الحجۃ، مولفہ مرزا غلام احمد صاحب، صفحہ ۱۸، ۱۹)

حضرت مسیح علیہ السلام آٹھ سال تک طرابلس ہی میں مدفون رہے۔ آخر قادیانی صاحب نے ارادہ کیا کہ ان کے جسد اطہر کو طرابلس سے ہندوستان کے کسی مقام میں منتقل کر دیں۔ چنانچہ بہت کچھ غور و خوض کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ اسے سری نگر (واقع ریاست کشمیر) لا کر یوز آسف کی قبر میں سپرد خاک کر دیا جائے۔

چنانچہ یوز آسف کی قبر کھول کر اس کی بوسیدہ ہڈیاں باہر پھینک دی گئیں اور حضرت مسیح علیہ السلام یوز آسف کی خالی لحد میں لٹا دیئے گئے۔ جب قادیانی مسیح نے اس کام سے فراغت پائی تو ۱۲ جون ۱۹۰۲ء کو رسالہ الہدی شائع کیا جس کے صفحہ ۱۰۹ پر لکھا کہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ عیسیٰ نے ملک کشمیر کی طرف ہجرت کی۔ اس کے بعد اللہ نے آپ کو اپنے فضل سے نجات دی اور اس ملک میں بہت مدت تک بستے رہے، حتیٰ کہ مر گئے اور مردوں میں جا ملے اور آپ کی قبر شہر سری نگر میں اب تک موجود ہے۔

اس تفصیل کے بعد قارئین کرام بخوبی سمجھ گے ہوں گے کہ قادیانی صاحب نے جس رنگ سے مسئلہ وفات مسیح علیہ السلام کی گتھی کو سلجھایا، سرسید کا دماغ وہاں تک نہ پہنچ سکا تھا۔

## مسیح قادیان سے ایک نیچری کا مناظرہ

جریدہ الفضل قادیان نے ۲۳ مئی ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں لکھا کہ اگر بالفرض سرسید نے اسلام کی خدمت کی ہے تو پھر ہم کہتے ہیں کہ اس نے حضرت مسیح موعود کے مقابلے میں کچھ نہیں کیا کیونکہ اس کی تمام کوشش اور سعی جو اس نے اپنے خیال میں اسلام کے متعلق کی، وہ اس کے ساتھ ہی اس کی قبر میں داخل ہو گئی۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس گفتگو کا ذکر کر دیا جائے جو ایک مرتبہ قادیان کے خانہ ساز مسیح موعود سے کسی نیچری کی ہوئی تھی۔

چنانچہ قاضی فضل احمد صاحب لدھیانوی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرسید احمد خاں بہادر کے ایک مرید سے مرزا غلام احمد کی جھڑپ ہو گئی دوران گفتگو قادیانی صاحب نے اپنی معتاد خود ستائی سے کام لیتے ہوئے نیچری سے کہا کہ تمہارے پیرومرشد سرسید احمد خاں نے مدت العمر اسلام کی کیا خدمت انجام دی۔



کونسا اہم کام کر دکھایا۔ قوم مسلم کی کیا اصلاح کی۔ اس پیرو نے جواب دیا کہ سرسید نے یہ ایک نہایت یادگار کارنامہ انجام دیا کہ اپنی تفسیر احمدی میں مسیح علیہ السلام کی وفات ثابت کر کے آپ کی مسیحیت کیلئے راستہ صاف کر دیا۔ یہ ایسا احسان ہے جس کے بار سے آپ مدت العمر سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ مرزا صاحب لا جواب ہو گئے اور بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔

(کلمہ فضل رحمانی صفحہ ۵۹)

کہا جاتا ہے کہ قطب نما کا موجد اپنی ایجاد اختراع سے مقامات کا رخ اور جہت معلوم کرنے کے سوا کوئی اور کام نہ لے سکا تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد کسی اور شخص نے اس سے ہزار ہا من بوجھ اٹھانے کا کام بھی لیا۔ اسی طرح سرسید احمد خان بہادر نے تو حضرت مسیح علیہ السلام کو زمرۂ اموات میں داخل کر کے صرف مغربیت زدہ ابنائے تعلیم جدید کی دلجمعی کی تھی۔ لیکن رئیس قادیاں نے سرسید کی اس ایجاد سے بڑے بڑے کام لئے۔ اس بنیاد پر اپنی مسیحیت کی بلند عمارت کھڑی کی۔ اس کے ذریعہ سے لاکھوں روپیہ کمایا اور داد عیش و عشرت دی اور نہ صرف باپ دادے کے قرضے اتارے بلکہ اپنی اولاد کے لئے ایک ریاست قائم کر گئے۔

(رئیس قادیان صفحہ ۳۱۰-۳۰۴)

## ایک غلط فہمی اور اس کی حقیقت

بعض لوگ جو کہ کچھ زیادہ ہی انگریزی تعلیم کے قائل ہیں اور اس کی تہذیب کے دلدادہ ہیں وہ یا تو جان بوجھ کر یہ بات کہتے پھرتے ہیں یا انکو روایت غلط پہنچی ہے۔ وہ یہ کہ اس وقت کے مولویوں نے سرسید احمد خان پر اس لئے کفر کا فتویٰ دیا تھا کہ وہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم عام کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلمان جدید تعلیم حاصل کر کے دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ مولوی چونکہ انگریز کی خلاف تھے اس لئے انہوں نے سرسید احمد خان پر کفر کا فتویٰ دے دیا۔ درحقیقت یہ بات ہی غلط ہے۔ یہ بات محض انگریز کے نوکروں نے اڑائی تاکہ علماء کے متعلق لوگوں کی رائے اچھی نہ رہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سرسید احمد خان پر کفر کا فتویٰ ان کے عقائد کی بنیاد پر دیا گیا تھا۔ اس فتویٰ کی عبارت میں کہیں بھی انگریزی تعلیم کا تذکرہ نہیں ہے۔ یہ فتویٰ بھی ”نصرۃ الابرار“ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ فتویٰ بھی علماء لدھیانہ نے ہی دیا تھا جس پر بعد میں پانچ سو علماء نے دستخط کئے تھے۔

(از مؤلف)





قسط ۲

# قاضی شریح

ڈاکٹر خورشید احمد فارق، دہلی

حضرت علیؓ کے بعد جب امیر معاویہؓ کے عہد خلافت (۴۱ھ تا ۶۰ھ) میں زیاد بصرہ اور کوفہ کا گورنر تھا (۵۰ھ تا ۵۳ھ) شریح کی چند جھلکیاں پھر نظر آتی ہیں۔ یہ وہ زیاد ہے جس کو ایک عرصہ تک غلام ماں باپ کا لڑکا سمجھا جاتا تھا، اس کی ماں تو بالاتفاق غلام تھی لیکن باپ کے بارے میں دو رائیں تھیں، ایک یہ کہ وہ کوئی عبید نامی غلام تھا دوسرے یہ کہ وہ امیر معاویہؓ کے والد ابوسفیانؓ تھے۔ زیاد چودہ سال کی عمر سے بصرہ میں کلرک سیکریٹری اور منتظم مالیات کے فرائض انجام دے کر ۳۸ھ میں حضرت علیؓ کی طرف سے صوبہ فارس کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ ۴۴ھ میں امیر معاویہؓ نے متعدد ثقہ شہادتوں کے پیش نظر ایک پبلک جلسہ میں اس کو اپنا بھائی تسلیم کیا اور اس کی غیر معمولی لیاقت انتظام و تدبیر سیاست سے متاثر ہو کر ۴۵ھ میں بصرہ کا گورنر مقرر کیا۔ ۵۰ھ میں کوفہ کے گورنر بن مغیرہ بن شعبہ کی وفات پر اس کو کوفہ کی حکومت بھی سونپ دی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں کئی بار زیاد کا امتحان لیا تھا اور اس کی قرآنی و فقہی لیاقت سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ بصرہ کے اعیان کو اس کے مشوروں اور فیصلوں پر عمل کرنے کی ہدایت کی تھی۔

۵۰ھ میں جب اس کو بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری دی گئی تو وہ چھ ماہ بصرہ میں قیام کرتا۔ اور چھ ماہ کوفہ میں گورنر ہو کر جب وہ کوفہ آیا تو شریح کی جچی کا ہر طرف شہرہ تھا، ایسا قابل اور راستباز جج پا کر وہ بہت خوش ہوا، بصرہ میں جہاں وہ ۴۵ھ سے گورنر تھا اس کو کامیاب جج نہیں ملے تھے اور اس وقت تک کئی جج بدلے جا چکے تھے۔ بصرہ کی آبادی کوفہ سے زیادہ تھی اور وہاں کے انصافی مسائل کے لئے ہمیشہ لائق جج کی ضرورت رہتی تھی، لیکن کوفہ کو بھی شریح کے بغیر نہیں چھوڑا جاسکتا تھا تاہم وہ اہل بصرہ کو ان کی سیرت اور راستباز عقل کے جوہر دکھانا ضروری سمجھتا تھا۔ چنانچہ وہ ان کو ساتھ لے کر بصرہ اور ان کی جگہ ابن مسعودؓ کے حلقہ کے فاضل کو جن کا نام مسروق بن اجدع تھا ان کا جانشین مقرر کیا۔

مصنف عقد الفرید ۳/۲۳۷ (مصر ایڈیشن) لکھتا ہے کہ بصرہ آکر زیاد شریح کے ساتھ مجلس



قضا میں بیٹھتا اور کہتا اگر میں ایسا فیصلہ کروں جو آپ کی رائے میں قرین انصاف نہ ہو تو مجھے مطلع کیجئے گا، لیکن شریح کو اس سے اختلاف کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ایک دن جماعت انصار کا ایک شخص آیا اور کہا میں بصرہ اس وقت آیا تھا جب مکانات بنانے کے لئے حکومت کی طرف سے دی ہوئی زمینیں موجود تھیں، چنانچہ ایک قطعہ زمین پر میں نے مکان بنانا چاہا میرے چچا زاد بھائی پہلے سے مکان بنا کر آباد ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا تم کہاں الگ رہو گے ہمارے پاس ہی مکان بنا لو۔ انہوں نے مجھے زمین دے دی اور میں نے مکان بنالیا اور شادی کر لی۔ پھر شیطان نے ہمارے درمیان پھوٹ ڈالی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ نکل جاؤ، یہ سن کر زیاد نے مدعی علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فیصلہ دیا تم کو نکالنے کا حق نہیں ہے، جب خالی زمین موجود تھی تم نے اس کو الگ مکان بنانے سے باز رکھا تمہارے پاس ضرورت سے زیادہ زمین تھی وہ تم نے دے دی، اب جب کہ زمینیں ختم ہو چکیں تم اس کو نکالتے ہو اور نقصان پہنچانا چاہتے ہو، وہ گھر نہیں چھوڑے گا۔ شریح نے اس فیصلہ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ”یا مستعیر القدر اِرددھا“ (ہانڈی مستعار لینے والے ہانڈی لوٹا دے) یعنی زمین کا معاملہ اس ہانڈی کا سا ہے جو مستعار لی گئی ہو اور جس کا لوٹنا واجب ہو۔ زیاد نے شریح کے اس قیاس کو غالباً قیاس مع الفارق سمجھ کر منظور نہیں کیا اور اپنا فیصلہ بحال رکھا۔ ان فیصلوں پر ابن سیرین (متوفی ۱۰۵۰ھ) جو شریح کے ہم عصر اور بصرہ کے ممتاز مفتی تھے تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں فیصلہ وہی ہے جو شریح نے کیا لیکن زیاد کا قول مستحسن ہے۔

شریح زیادہ عرصہ اپنے مستقر سے الگ نہ رہ سکے، ایک سال بعد ہی ان کو لوٹنا پڑا، ابن زیاد بحوالہ مصنف طبقات ۶/۹۵ کہتے ہیں۔ زیاد شریح کو لے کر بصرہ سے آیا اور انہوں نے ایک سال تک ہمارے درمیان ایسا انصاف کیا جیسا ان سے پہلے یا بعد کسی نے نہیں کیا۔ اصابہ میں ایک دوسری سند پر بالکل یہی روایت پیش کی گئی ہے۔ اصابہ کی ایک دوسری روایت کے مطابق شریح سات سال تک بصرہ کے قاضی رہے لیکن اس کی صحبت پایہ تحقیق کو نہیں پہنچ سکی ہے۔

زیاد کا ۵۳ھ میں انتقال ہوا جب وہ اپنے گرمی کے مستقر کوفہ میں تھا۔ اس کی انگلی میں ایک زہریلی پھنسی نکل آئی تھی جس کو کاٹنے کا طبیعوں نے مشورہ دیا تھا، زیاد نے استصواب رائے کے لئے اپنے معزز اور مخلص قاضی شریح کو بلایا، انہوں نے جس دل میں تھکا دینے والے انداز سے مشورہ دیا



وہ سننے کے لائق ہے۔ ”مجھے اندیشہ ہے کہ آپریشن انگلی میں ہو اور اس کا اثر دل تک پہنچے اور آپ کی موت کا وقت آگیا ہو اور آپ انگلی کٹے خدا کے حضور میں جائیں اور انگلی آپ نے خدا کی ملاقات سے بچنے کی خاطر کٹوائی ہو یا بصورت دیگر آپ کی موت کا وقت نہ آیا ہو اور انگلی کٹوا چکے ہوں اور بقیہ عمر بغیر انگلی کے زندہ رہیں اور آپ کے بچوں کو اس کا طعنہ دیا جائے“ اس صاف مشورہ سے زیادہ دل کا تردد دور ہوا اور انگلی کٹوانے کا ارادہ اس نے ترک کر دیا۔

۶۰ھ میں شریح کی ایک ہلکی سی جھلک پھر نظر آتی ہے۔ ۶۰ھ میں امیر معاویہؓ کی وفات اور یزید کی خلافت پر کوفہ میں بڑی شدت سے حضرت حسینؓ کی خلافت کی تحریک اٹھی۔ شیعوں کے وفدان کے پاس مدینہ جانے لگے اور وفاداری و جاں نثاری کے عہد و پیمان سے مملو اتنے خط شیعہ لیڈروں کے ان کے پاس آئے کہ وہ تھیلے بھر گئے۔ حضرت حسینؓ اہل کوفہ کی اس بد عہدی کو نہیں بھولے تھے جیسے وہ ان کے والد اور بھائی کے ساتھ پیش آئے تھے۔ اس لئے انہوں نے شیعوں کی وفاداری کو پرکھنا ضروری سمجھا اور اس مقصد کے لئے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجا۔ وہ مختار ابن ابی عبید (متوفی ۶۱ھ) کے گھر ٹھہرے اور حضرت حسینؓ کے لئے بیعت لینا شروع کی۔ جلد ہی بارہ ہزار شیعوں نے بیعت کر لی۔ یزید کو اس انقلابی تحریک کا جب علم ہوا تو اس نے کوفہ کے موجودہ گورنر نعمان بن بشیرؓ کی جگہ ابن زیاد کو کوفہ کی امارت بھی سونپ دی۔ عبید اللہ بن زیاد مستعد حاکم تھا وہ ڈاک کے گھوڑوں سے کوفہ آیا اور بغاوت کو دبانے میں لگ گیا۔

عبید اللہ شیعہ عرب سردار ہانی بن عروہ اور ایک دوسرے مقتدر لیڈر شریک بن اعمور کی بڑی عزت کرتا تھا۔ شریک بصرہ سے اس کے ساتھ آیا تھا وہ بظاہر عبید اللہ کا نبی خواہ لیکن دل میں اس کا دشمن اور اہل بیت کا دوست تھا۔ کوفہ آکر وہ ہانی کے گھر فروکش ہوا جہاں مختار کا غیر محفوظ گھر چھوڑ کر مسلم پہلے ہی پناہ لے چکے تھے۔ یہاں وہ بیمار پڑا، اور عبید اللہ نے اس کی عیادت کرنا چاہی، شریک نے یہ موقع غنیمت جانا اور مسلم کو عبید اللہ کے دوران عیادت میں قتل کرنے پر ہموار کر لیا۔ عبید اللہ آیا اور شریک کی مزاج پر سی کرتار ہا لیکن مسلم نے حملہ نہیں کیا۔ تب شریک نے ایسے رمزیہ الفاظ نکالے جن سے عبید اللہ کے اردلی کو شبہ ہوا اور اس نے عبید اللہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بخیریت محل لوٹ آیا۔ اس کا ایک جاسوس شیعوں کے بھیس میں چھوڑا ہوا تھا، اس نے مسلم کی قیام گاہ اور ان کی جنگی تیاریوں کا مکمل پتہ چلا لیا۔



شریک کا تیسرے دن انتقال ہو گیا۔

عبید اللہ کو ہانی کی غداری پر بہت غصہ آیا اس نے ہانی کو بلایا اور گوہانی نے بہانے بنائے اور بالآخر ان کو آنا ہی پڑا۔ عبید اللہ کی مجلس میں اس وقت شریح موجود تھے، ہانی کو مخاطب کر کے عبید اللہ نے کہا تمہیں معلوم ہے میرے والد نے کوفہ آ کر تمہارے اور حجر بن عدی کے سوا سرغنہ شیعوں کو قتل کر دیا تھا۔ پھر حجر کا جو حشر ہوا وہ بھی تم کو معلوم ہے، اس کے قتل کے بعد وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رواداری اور حسن سلوک سے پیش آتے رہے، اس کا تم نے مجھے یہ صلہ دیا کہ اپنے گھر میں ایک شخص کو مجھے قتل کرنے کے لئے چھپا لیا ہے۔ ہانی نے اس کی تردید کی عبید اللہ نے اس جاسوس کو بلایا جو شیعوں کے بھیس میں ہانی کے گھر میں ہونے والی جنگی تیاریوں اور مسلم کے قیام سے واقف تھا اس کو دیکھ کر ہانی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، تاہم اس نے معذرت کی اور عبید اللہ کو یقین دلایا کیا اس نے جو کیا مجبوری کے تحت کیا۔ پھر ان کی گفتگو نے درشتی کا پہلو اختیار کیا (جس کی تفصیل طبری میں دیکھئے) اور ہانی نے سرکشی کی باتیں کیں، جن سے عبید اللہ اتنا برہم ہوا کہ اس نے ہانی کے منہ پر خوب چھڑیاں ماریں، جن سے وہ لہو لہان ہو گیا، پھر اس کو محل کے ایک کمرہ میں مقید کر دیا گیا۔ منٹوں میں ہانی کے قبیلہ مذحج میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ہانی قتل کر دیئے گئے اور وہاں کے جوان بھرے ہوئے محل کی دیوار تلے جمع ہو کر شور و غوغا مچانے لگے۔ اس موقع پر شریح سے زیادہ موزوں آدمی اس شورش کو فرو کرنے کے لئے نہیں تھا کیونکہ ان پر سب بھروسہ کرتے تھے۔ پولیس کے چند سپاہیوں کو ان کے ہمراہ کر کے عبید اللہ نے کہا آپ ہانی کو دیکھئے اور پھر لوگوں کو اطمینان دلا دیجئے کہ ساتھ لے جائیں ورنہ عبید اللہ مجھے قتل کر دے گا۔ شریح لوٹ کر عبید اللہ کے پاس گئے اور کہا وہ زندہ تو ہے لیکن اس کے زخم بہت کاری ہیں، عبید اللہ نے تیور بدل کر کہا کیا آپ کو یہ بات ناپسند ہے کہ حاکم اپنی رعیت کو سزا دے، جائیے لوگوں کو مطلع کیجئے۔ شریح اس نازک مشن سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ ایک لفظ جھوٹا ان کی زبان سے نہ نکلا انھوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا یہ بیہودہ خوف دہرا اس کیسا؟ ہانی زندہ ہیں۔ حاکم نے ان کو مار کی سزا دی ہے جس سے وہ مرے نہیں، ہیں لہذا آپ لوگ لوٹ جائیے انہیں اپنی شوریدہ سری کی سزا دی ہے جس سے وہ مرے نہیں ہیں۔ لہذا آپ لوگ لوٹ جائیے اور اپنی شوریدہ سری سے خود کو اور اپنے سردار کو خطرہ میں نہ ڈالیں۔ لوگ شریح کا یہ اعلان سن کر لوٹ گئے۔



۶۴ھ میں یزید بن معاویہ کا جب انتقال ہوا تو عبید اللہ بن زیاد کوفہ اور بصرہ کا گورنر تھا۔ اس وقت اس کا قیام بصرہ میں تھا، وہاں کے لوگوں نے نئے خلیفہ کے گورنر کے تقرر تک اس کو حاکم تسلیم کر کے اس کی بیعت کر لی تھی، جس کو انھوں نے بہت جلد توڑا اور عبید اللہ کی اتنی مخالفت بڑھی کہ اس کو بصرہ سے بھاگنا پڑا۔ اہل بصرہ کی بیعت کے بعد اس نے ایک وفد کوفہ بھیجا اور وہاں کے لوگوں کو بھی نئے خلیفہ کے نمائندے تک اپنی بیعت کی طرف مائل کیا لیکن وہ نہ صرف یہ کہ تیار نہیں ہوئے بلکہ اس کے جانشین گورنر کو بھی نکال دیا۔ شام میں یزید کا لڑکا معاویہ خلیفہ ہوا مکہ میں پہلے ہی ابن زبیرؓ اپنی خلافت کا اعلان کر چکے تھے۔ لیکن بصرہ اور کوفہ کے لئے ان دونوں میں سے کسی کے گورنر مقرر نہیں ہوئے تھے اس لئے یہاں کا امن و امان سخت خطرہ میں تھا، مرکز خلافت کے نمائندہ کے تقرر تک کوفہ کے ارباب رائے نے عارضی طور پر عامر بن مسعود کو نماز جماعت کا امام تسلیم کر لیا تھا۔ اس حالت میں جب کہ شہر سے باقاعدہ حکومت اٹھ چکی تھی اور سیاسی مطلع ابراہیمؓ آلود تھا شریح منصب قضا سے دست بردار ہو گئے اور تقریباً دو سال تک رہے۔ یعنی ۶۴ھ سے ۶۵ھ تک۔ ۶۶ھ میں وہ پھر قضائے کوفہ افتخار پر ذرا دیر کے لئے ابھرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مختار بن ابی عبید اہل بیت کے نمائندہ اور مظلوموں کے مددگار کی حیثیت سے ابن زبیرؓ کے گورنر کو نکال کر کوفہ پر قابض ہوا، اور خاص و عام کو خوش کر کے ایک مرکزی حکومت قائم کی۔ اول وہ صبح شام خود مجلس قضا میں بیٹھ کر فیصلے کرتا لیکن حکومت کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے جلدی اس کو اس کام کے چھوڑنے پر مجبور کیا اور منصب قضا شریح کے سپرد کر دیا گیا۔ شریح نے شاید بادل ناخوستہ اس کو قبول کیا کیونکہ ماحول خرابیت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ شیعیت پہلی بار فتح پا کر آپے سے باہر تھی، کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ان پر اعتراض ہونے لگا کہ وہ (۱) عثمانی ہیں۔ (۲) انہوں نے حجر بن عدی کے خلاف شہادت دی تھی (۳) ۵۳ھ میں جب حجر نے کوفہ میں بغاوت کر کے حکومت الٹنا چاہی تھی (۴) انھوں نے ہانی بن عروہ کا پیغام نہیں پہنچایا تھا۔ (۵) ان کو حضرت علیؓ نے معزول کر دیا تھا۔ یہ اشارہ ہے ان کی چالیس دن تک بانقیاء میں جلاوطنی کی طرف۔ شریح نے اپنی روح اور جسم کی سلامتی کنارہ کشی میں دیکھی اور گھر بیٹھ رہے۔ مختار نے ان کی جگہ ابن مسعودؓ کے پوتے عبید اللہ کو قاضی مقرر کیا۔ اس کنارہ کشی کا خاتمہ حسب تصریح طبری ۶۸ھ میں ہوا۔ غالباً دو سال بعد ان دو سالوں میں اٹھارہ ماہ مختار کے دور اقبال اور شاید چھ ماہ کے لگ بھگ مصعب بن زبیر کی ولایت عراق (بصرہ و



کوفہ) کے شامل ہیں۔ مصعب نے اپنے بھائی ابن زبیر کی طرف سے مختار کو شکست دے کر رمضان ۶۷ھ میں کوفہ پر قبضہ کیا تھا۔ ۶۸ھ سے ۶۹ھ تک جب انہوں نے استعفیٰ دیا ایسا معلوم ہوتا ہے وہ مسلسل قاضی رہے۔ طبری نے شرح کی کنارہ کشی جن سالوں میں پیش کی ہے یہاں یہ واضح رہے کہ طبری بس اتنا ہی بتاتے ہیں کہ کس سال کون کوفہ کا قاضی تھا۔ یعنی ۶۴ھ سے ۶۵ھ تک پہلی بار اور کچھ عرصہ قاضی رہنے کے بعد مختار کے زمانہ میں ۶۶ھ سے ۶۸ھ کے چند ماہ تک دوسری بار ان کا موٹا حساب لگانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چار سال کے قریب معطل رہے۔ پیش نظر کتابوں میں ان کے تعطل کے بارے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ وہ تین سال تک معطل رہے یہ روایت طبری کی تاریخوں سے جو موٹا حساب بنتا ہے اس کے قریب تر ہے۔ کتاب المعارف وفيات الاعیان شرح نہج البلاغۃ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ نو برس تک معطل رہے، یہ روایت طبقات ابن سعد کے ایک راوی نے پیش کی ہے اس کے الفاظی یہ ہیں۔ دوران فتنہ میں شرح نو سال تک بیکار رہے نہ کسی کو خبر سنا تے نہ کسی سے سنتے، فتنہ سے مراد ابن زبیر اور اموی سرداروں کی خلافت کے لئے باہمی پیکار کا زمانہ ہے (۶۴ھ سے ۶۷ھ تک) اس رائے کو تقویت متعدد تاریخی اشاروں سے ملتی ہے لیکن جب تک قطعی شہادت فراہم نہ ہو اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ زمانہ تعطل سے زیادہ مختلف فیہ مسئلہ ان کی مدت قضاء بقا اور سن وفات کا ہے۔ مصنف استیعاب اور شرح نہج البلاغۃ کی رائے میں وہ ساٹھ سال تک قاضی رہے۔ مصنف معارف اور وفيات کی رائے میں پچھتر سال تک۔ طبری کی تاریخوں سے مدد لے کر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ پہلی رائے کے حق میں ہے۔ ان کی عمر کے بارے میں یہ رائیں دی گئی ہیں: ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۲۰ سال۔ بسند رواۃ اغانی ۱۶۸، سال بسند شرح نہج البلاغۃ ۱۰۸ سال، بسند راوی ابن سعد ۱۲۱ سال، بسند راوی اصابہ ۱۰۰ سال، بسند استیعاب حاشیہ اصابہ ۱۲۰ سال، بسند کتاب المعارف و تاریخ ابن الاثیر۔ ان کے سن وفات کا مسئلہ عمر سے بھی زیادہ الجھا ہوا ہے۔

ذیل کے سن پیش کئے گئے ہیں۔

۸۰ھ یا ۷۹ھ سن وفات بتاتے ہیں ۸۷ھ بسند اصابہ، ۷۶ھ اغانی و طبقات بسند روایت آخر ۸۰ھ اصابہ، بسند راوی خلیفہ، ۸۶ھ اصابہ روایت ابن معینی ۹۶ھ یا ۹۷ھ تاریخ ابن الاثیر۔



## پرہیزگار وہی ہیں جو حقوق کی ادائیگی کرتے ہوں

”لقد خلقنا الانسان في احسن تقويم“ کہ ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈالا ہے

(التین ۴)

صحیح انسان کون؟۔ اگر ہم انسائیکلو پیڈیا اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے مختلف دانشوروں اور فلسفیوں نے انسان کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے مثلاً قدیم علوم یونانی کے عالم ارسطو Aristotle نے کہا کہ انسان اسے کہتے ہیں جو بول سکتا ہے Man is a creation which can be speak بقراط نے کہا کہ انسان وہ ہے جو اپنے خاندان کو پال سکے اور اس کی نگہداشت کر سکے۔

امام غزالی نے کہا کہ انسان کو ازلی نہ کہو وہ ابدی ہے یعنی جب سے مجسم آیا ہے اسے بقا ہی بقا وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں بس اس کے مقامات تبدیل ہوتے رہتے ہیں مثلاً پہلے وہ ماں کے پیٹ میں تھا پھر دنیا میں آیا اس دنیا میں اپنے جھنڈے گاڑے گا پھر ایک مقررہ مدت کے دنیا کو چھوڑ دے اور قبر کے پیٹ میں سما جائے گا پھر قبر سے میدان حشر میں آئے گا جہاں اس کا حساب کتاب ہوگا اس کے بعد اپنے کئے گئے اعمال کے حساب سے جنت یا دوزخ کی راہ لے گا۔ پس انسان ابدی ہے اور مسلسل سفر میں ہے منزل اچھی جی بھی ملے گی جب اعمال اچھے کئے ہوں گے۔ قرآن مجید نے بھی انسان کو مختلف مقامات پر مختلف انداز سے پکارا ہے۔ مثلاً: ترجمہ ”قسم ہے زمانے کی! بے شک وہ بالیقین انسان نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور جنہوں نے آپس میں حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔ پھر سورہ بقرہ میں انسان کے صحیح عقیدے کی تعریف متعین کر دی۔“ ترجمہ ”نیک یہ نہیں کہ تم نے اپنے منہ مشرق کی طرف کر لیا مغرب کی طرف بلکہ نیک یہ ہے کہ آدمی اللہ پر اور یوم آخرت اور فرشتوں پر اور سب کتابوں (سماویہ) پر اور پیغمبروں پر یقین رکھے اسکی محبت میں مال خرچ کرے قرابت داروں، یتیموں مسکینوں مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے۔ غلاموں کو آزاد کرے نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرے جب وعدہ کرے تب اسے پورا کرے تنگ دستی دکھ اور لڑائی کے وقت صبر کرے یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں۔“



سورہ بقرہ کی اس آیت میں ایمان کے بارے میں تفصیل دی جا رہی ہے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ بھلائی یہ ہے کہ انسان کے دل میں اطاعت اور فرمانبرداری کا مادہ پیدا ہو جائے تمام فرائض پابندی اور غور فکر کے ساتھ ادا کئے جائیں اور وہ تمام بھلائیوں کا عامل بن جائے پس حق تو یہ ہے کہ جس نے اس آیت پر عمل کر لیا اس نے اسلام پر مکمل عمل کیا اور دل کھول کر بھلائی سمیٹ لی پس قرآن کی نظر میں صحیح انسان وہی ہے جس نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ مختصر یوں کہا جاسکتا ہے۔ کہ صحیح انسان اس کو کہتے ہیں جو ہر کسی کا حق پہچان سکے چاہے وہ حق اللہ کا ہو، فرشتوں کا ہو، یتیموں کا ہو، مسکینوں کا ہو، مسافروں کا ہو اور چاہے سوال کرنے والوں کا ہو۔

حقوق میں ہر آدمی پر ماں باپ کے مقابلے میں پہلا حق اس کی بیوی کا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ ماں باپ کا انتخاب نہیں کرتے لیکن بیوی کا انتخاب آپ خود کرتے ہیں اس کو دوسرے ماحول سے نکال کر لاتے ہیں اور اس کو اپنے ماحول سے مانوس کرواتے ہیں آپ اس کو چاہتے ہیں اس کو پیار کرتے ہیں چنانچہ بیوی حقوق کے لحاظ سے پہلے نمبر پر ہے دوسرے نمبر پر اس کی ماں اور تیسرے نمبر پر باپ ہے پھر بیٹی، علیٰ ہذا القیاس اس طرح ۱۹ درجے بنتے ہیں جس میں سولہویں نمبر پر استاد اور سترہویں نمبر پر مرشد آتا ہے۔ دائیں طرف کے پڑوسی کا درجہ بائیں طرف کے پڑوسی سے پہلے آتا ہے۔ سورہ النساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے اور ماں باپ دونوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی۔ (آیت نمبر ۳۶)

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ فرماتے تھے کہ میں نے ۲۵ سال تک گھٹنے دوہرے کر کے اپنے شیخ کے سامنے قرآن پڑھا۔ صرف تین دن پڑھتا تھا منگل بدھ اور جمعرات اور جمعہ کو غور فکر کرتا تھا کہ جو کچھ پڑھا ہے اس پر کتنا عمل کیا ہے ہفتے کو طالب علموں کو ساتھ لے جا کر جنگلوں میں جا کر لکڑیاں کاٹتے پھر ان لکڑیوں کو سکھر شہر لے جا کر فروخت کرتے اور پھر میں ان پیسوں سے مدرسے کے باورچی خانے کے لئے سودا سلف خرید کر لاتا۔ چونکہ مجھے مطبخ کا صرف انچارج بنایا گیا تھا اس لئے کبھی کھا بھی لیتا تو کسی کو کیا پتہ چلتا مگر چونکہ پیرو مرشد نے صرف مطبخ کی نگرانی کا حکم دیا تھا اس لئے ان کے لفظوں پر حرف بحرف عمل کیا آنکھ اٹھا کر بھی ہنڈیا کی طرف نہیں دیکھا۔ سات برس تک صرف جنگلی پتے اور جڑی بوٹیاں کھاتا رہا۔ یہ اسی فرمانبرداری کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پتے کھانے والی زبان کو اتنا اثر اور درد دیا کہ ۲۵ سال تک پڑھا ہوا قرآن



*www.milliafsd.com*



منشی نول کشور کے نام سے ادبی دنیا بخوبی واقف ہے بڑا کٹر ہندو تھا۔ مندر میں جا کر عبادت کرتا تھا اس زمانے میں جرمن ساخت کا پتھر کا بنا ہوا چھاپہ خانہ ہندوستان میں لایا گیا، جس پر سب سے پہلے انجیل چھاپی گئی تھی منشی کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اس چھاپے خانے پر میں سب سے پہلے ہندو اور مسلمانوں کی مذہبی کتابیں چھاپوں۔ چنانچہ چھاپہ خانہ شروع کیا جب قرآن مجید کی باری آئی تو اس کو خواب میں ایک بزرگ نظر آئے فرمایا میں تم سے بہت خوش ہوں لیکن جب تم قرآن شریف چھاپنے لگو تو با وضو ہو جایا کرو اس نے ایسا ہی کیا اور اس طرح قرآن کو چھاپنے سے اس کا کاروبار ایسا چمکا کہ بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر اس کے پریس سے اپنی کتابیں چھپوانا باعث فخر سمجھتے تھے۔ یہ صرف اور صرف قرآن کی خدمت کا صلہ ملا ہے اس کی موت پر اس کے جنازے پر تمام علماء اور ہندو شاعر شریک تھے۔

اس دنیا میں رہ کر جو کچھ بھی کمایا جائے وہ برا نہیں۔ ایمان داری سے صحیح تجارت کر کے رزق حلال کما کر اگر آپ لکھ پتی بن سکتے ہیں تو اسلام اس کی ممانعت نہیں کرتا لیکن صرف پیسے کو ہی اپنا مقصود نہیں بنالینا چاہئے کہ دن رات کمانے اور پیسہ بنانے کے چکر میں لگے رہیں اپنے فرائض کو بھول جائیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ کسب دنیا منع نہیں ہے جب دنیا منع ہے یعنی دنیا جتنی بھی چاہے کما لو مگر اس کی محبت دل میں مت رکھو اور بلکہ ایسے خصائل پیدا کرو جو بزرگوں میں تھے۔

تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک بہت بڑی سلطنت کے مالک تھے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کی بادشاہت عطا ہوئی تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ کو خلافت ملی تھی حضرت عثمانؓ لاکھ لاکھ درہم سے مسلمانوں کے لئے کنواں خریدتے تھے، پس یہ لوگ روپیہ پیسہ اور اقتدار پا کر آپے سے باہر نہیں ہوئے، مصر میں قحط پڑا تو حضرت یوسف علیہ السلام پیٹ بھر کر کھانا کھاتے تھے۔

اب آپ بھی اپنے کمائے ہوئے روپے سے یتیموں کا سہارا بن سکتے ہیں بیواؤں کی خبر گیری کر سکتے ہیں مساجد اور مدارس بنوا سکتے ہیں چنانچہ مال کو ایسی جگہوں میں خرچ کرنے سے توشہ آخرت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کا صلہ بھی قرآن کریم کی سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶۱ کے مطابق سات سو گناہ ملتا ہے پس حلال طریقہ سے دنیا کمائیں اور اپنی ضروریات پورا ہونے کے بعد باقی سرمایہ کو راہ خدا میں خرچ کریں اور انسانوں کے دکھ درد باٹ لیں۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروپیاں

خلاصہ کلام یہ کہ دنیا کماؤ مگر مقصد حیات صرف اور صرف اللہ کے احکام کی تعمیل کرنا ہے اگر اللہ کے احکامات کو پورا کرنا مقصد حیات بنالیا تو گویا اس دنیا میں آنے کا مقصد پالیا اور کامیاب لوگوں میں شمار ہوگا۔ ہماری قبریں خوبصورت اور منور ہوں گی اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں جنت میں داخل کرے گا۔



## فضیلت انبیاء

ماخوذ از..... کشف المحجوب

صوفی مشائخ کبار تمام اس امر پر متفق ہیں کہ اولیاء ہر حال اور ہر صورت میں انبیاء کے تابع اور انکی دعوت کی تصدیق کرنے والے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اولیاء سے افضل تر ہوتے ہیں کیونکہ ولایت کی انتہا نبوت کی ابتدا ہوتی ہے ہر نبی ولی ہوتا ہے مگر ولیوں میں کوئی نبی نہیں ہوتا۔ انبیاء انسانی کمزوریوں سے مستقل پاک ہوتے ہیں اور اولیاء صرف عارضی طور پر اولیاء کا احوال طاری، انبیاء کا مستقل مقام ہوتا ہے اور جو اولیاء کے لئے مقام ہو وہ انبیاء کے لئے حجاب کی حیثیت رکھتا ہے یہ اہل سنت اور صوفیائے کرام کا متفقہ فیصلہ ہے جسو یہ کا ایک گروہ یعنی مجسمہ خراسان اس کے خلاف ہے یہ لوگ اصول توحید پر متناقض کلامی سے کام لیتے ہیں صوفیائے کرام کے منکر ہیں اور اپنے آپ کو ولی سمجھتے ہیں۔ ہاں ولی ہی ہوں گے مگر شیطان کے ولی۔ کہتے ہیں کہ اولیاء انبیاء سے فاضل تر ہیں۔ یہ ضلالت ہی ان کے لئے کافی ہے کہ جاہل کو محمد ﷺ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اس قسم کا بے ہودہ عقیدہ مشتبہ جماعت کے لوگوں کا ہے جو صوفی کہلاتے ہیں اور ذات باری سے متعلق حلول و نزول ازراہ انتقال پر یقین رکھتے ہیں تجزیہ ذات حق کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ اس مکتبہ کی دو جماعتیں ہیں جن سے متعلق کسی کتاب میں تفصیلاً ذکر کرنے کا وعدہ ہے انشاء اللہ تعالیٰ یہ مذکورہ جماعتیں دعوائے اسلام کرتی ہیں مگر انبیاء کرام کی تخصیص کے معاملے میں برہمنوں کی ہم خیال ہیں تخصیص انبیاء کا منکر کافر ہوتا ہے۔

انبیاء کرام دعوت دینے والے اور امام ہوتے ہیں اولیاء ان کی مقتدی ہوتے ہیں یہ محال ہے کہ مقتدی امام سے فاضل تر ہو۔ مختصر یہ کہ اگر جملہ اولیاء کرام کے احوال۔ انفس و روزگار کو ایک جگہ رکھ کر نبی کے ایک گام صدق سے مقابلہ کیا جائے تو جملہ احوال و انفس پر اگندہ نظر آئیں گے کیونکہ اولیاء طلب میں گامزن ہوتے ہیں اور انبیاء منزل پر پہنچ کر گوہر مقصود حاصل کر چکے ہوتے ہیں اور اس کے بعد دعوت سے خلقت کو راہ حق دکھاتے ہیں۔ ان ملحدوں میں سے اگر کوئی ملعون یہ کہے کہ قاعدہ یہ ہے کسی ملک سے بھیجا ہوا سفیر مرسل الیہ سے فاضل تر نہیں ہوتا ہے، چنانچہ جبرائیل علیہ السلام پیغمبروں کے پاس آتے مگر پیغمبروں کا مقام جبرائیل علیہ السلام سے بلند تر تھا۔ ان لوگوں کا یہ خیال آرائی غلط ہے۔ ہم کہتے ہیں



کہ جب ایک سفیر ایک آدمی کی طرف بھیجا جائے تو یقیناً مرسل الیہ فاضل تر ہوگا۔ جبرائیل ایک ایک پیغمبر کے پاس آئے ہر پیغمبر جبرائیل سے فاضل تر ہوا لیکن جب رسول ایک جماعت یا قوم کی طرف بھیجا جائے تو لامحالہ وہ اس قوم سے فضل تر ہوگا جیسے ہر امت کا پیغمبر اس معاملے میں کسی ذی ہوش کو مغالطہ نہیں ہو سکتا الغرض نبی کا ایک سانس ولی کی ساری زندگی سے فاضل تر ہے جب ولی اپنے باطنی مجاہدہ اور ظاہری عبادت سے درجہ کمال کو پہنچتا ہے تو مقام مشاہدہ پر فائز ہوتا اور حجاب بشریت سے نجات پاتا ہے حالانکہ عین بشریت میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کی برعکس رسول کا پہلا قدم مشاہدہ ہوتا ہے رسول کی ابتدا ولی کی انتہا ہوتی ہے اس لئے ایک سے دوسرے کا تصور نہیں کیا جاسکتا تم جانتے ہو کہ سب طالبان حق بالاتفاق کہتے ہیں کہ کمال ولایت تفریق سے منقطع ہو کر جمع کے مقام کو حاصل کرنا ہے اس کی یہ صورت یہ ہوتی ہے کہ بندہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں غلبہ دوستی کے باعث عقل کا دستور نظر باطل ہو جاتا اور ہر چیز میں فاعل کل نظر آتا ہے۔ چنانچہ ابوعلی رودباریؒ نے فرمایا ”اگر ہم اس کی رویت سے محروم ہو جائیں تو ہماری عبادت بیکار ہو جائے کیونکہ اس کی عبادت کا شرف اس کی رویت ہی سے حاصل ہوتا ہے“ یہ حقیقت انبیاء کے لئے ابتدائے حال ہوتی ہے ان کے روزگار میں کوئی تفرقہ صورت پذیر نہیں ہوتا نفی، اثبات، مسلک، مقطع، اقبال، اعراض ہدایت اور نہایت سب عین جمع کے عالم میں ہوتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ابتدائے حال میں سورج کو دیکھ کر کہا ”یہ میرا رب ہے“ جب چاند ستارے کو دیکھا تو کہا ”یہ میرا رب ہے“ کیونکہ ان کا دل غلبہ حق سے مغلوب تھا وہ عین جمع کے مقام پر تھے انہوں نے کسی غیر چیز کو نہیں دیکھا اور اگر دیکھا تو جمع کی نظر سے دیکھا عین دیدار حق محو ہو کر تاب دیدار سے بیزاری کی حالت میں کہا ”میں گم ہونیوالوں سے محبت نہیں کرتا“ ابتدا اور انتہا ہے نبوت کے لئے نہیں۔ انبیاء جب تک تھے نبوت پر فائز تھے جب تک ان کو رہنا تھا نبوت پر سرفراز رہنا تھا بعثت سے پہلے بھی اللہ کے علم اور ارادے کے مطابق وہ صاحب نبوت تھے۔

ابو یزیدؒ سے پوچھا گیا آپ انبیاء کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ کہا ”خدا نا کردہ! ہم انبیاء کے بارے میں کیا فیصلے نہیں دے سکتے ان کی نسبت ہمارے تصورات ہماری ذاتی بساط کے مطابق ہوتے ہیں باری تعالیٰ نے انکی نفی اور اثبات ایسے مقام پر رکھی ہے جہاں انسانی نظر قاصر رہ جاتی ہے اولیاء کا مرتبہ لوگوں کی نظر پہناں ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا مقام اولیاء کے دائرہ تصرف سے باہر ہے“



ابو یزیدؒ برہان روزگار تھے انہوں نے فرمایا، ”میں نے دیکھا میری روح کو آسمان پر لے گئے۔ اس نے کسی طرف توجہ نہ دی گو دوزخ اور بہشت اس کے سامنے رونما ہوئے وہ حادثات اور حجابات سے معرا تھی۔ پھر میں ایک پرندہ بن گیا جس کا جسم وحدانیت تھا اور جس کے بازو ابدیت تھے میں فضائے ہویت میں اڑ گیا یہاں تک کہ فضائے ازلیت میں داخل ہوا اور شجر احدیت کو دیکھا۔ غور کیا تو سب کچھ میں ہی تھا۔ میں پکارا خدایا! جب تک میری انا موجود ہے تیری طرف راستہ ملنا محال ہے مجھے انا سے رستگاری نہیں بتا میں کیا کروں“ حکم ہوا ”ابو یزید! انا سے رستگاری ہمارے دوست کی متابعت سے وابستہ ہے اس کے قدموں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا اور اس کی تابعداری میں بسر کر۔ یہ داستان بڑی طویل ہے اہل طریقت اسے معراج ابو یزید کہتے ہیں معراج سے مراد قرب ہے۔ انبیاء علیہ السلام کا معراج جسمانی طور پر ظاہر ہوتا ہے اولیاء کرام کا معراج ہمت اور روح سے متعلق ہے انبیاء کا جسم صفا اور پاکیزگی میں قرب کے معاملے میں اولیاء کے دل اور ان کی روح کی مانند ہوتا ہے کہ ولی عالم سکر میں اپنے آپ سے غائب ہو جاتا ہے اور روحانی درجات سے گزر کر قرب حق کے مقام پر پہنچ جاتا ہے جب عالم صحو میں واپس پلٹتا ہے تو تمام دلائل اس کے دل پر نقش ہوتے ہیں اور ان کا علم اسے حاصل ہوتا ہے ظاہر ہے کہ جسمانی معراج اور اسکی فکری معراج میں زمین و آسمان کا فرق ہے واللہ اعلم بالصواب۔

### انبیاء و اولیا کی فرشتوں پر فضیلت

جملہ اہل سنت والجماعت اور مشائخ طریقت متفقہ طور پر مانتے ہیں کہ انبیاء اور وہ تمام اولیاء جو آفات سے محفوظ ہیں فرشتوں پر برتری رکھتے ہیں۔ صرف معتزلہ فرشتوں کو انبیاء سے افضل تر سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ فرشتوں کا رتبہ زیادہ ہے اور وہ پیدائشی طور پر لطیف واقع ہوئے ہیں بالخاصہ وہ باری تعالیٰ کی زیادہ طاعت کرتے ہیں اور اس لئے ان کا مقام بلند تر ہے میں کہتا ہوں کہ حقیقت اس مفہومہ صورت سے بالکل مختلف ہے جسمانی طاعت، مقامی، بلندی، اور پیدائشی لطافت فضل خداوندی کی مقررہ علت نہیں یہ تمام چیزیں تو ابلیس میں بھی موجود تھیں مگر سب مانتے ہیں کہ وہ ملعون اور ذلیل ہو کا فضل خداوندی اسی کے لئے ہوتا ہے جسے باری تعالیٰ خود ارزاں کرے اور جسے خود اس کی رحمت منتخب کرے انبیاء کی فضیلت کے لئے دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں یہ امر مسلمہ ہے کہ مسجود ساجد سے بالاتر ہوتا ہے اگر اس کے خلاف یہ کہا جائے کہ خانہ کعبہ بے جان پتھر کا بنا ہوا ہے مومن کا مقام بلند



تر ہے مگر وہ اسے سجدہ کرتا ہے اسی طرح فرشتے آدم کو سجدہ کرنے کے باوجود فاضل تر ہیں تو میں کہوں گا کہ کسی ہوش مند کے نزدیک مومن، دیوار، محراب یا پتھر کو سجدہ نہیں کرتا سجدہ صرف خدا کے لئے کیا جاتا ہے دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ ملائکہ نے سجدہ نہ صرف آدم کو کیا جیسا کہ حکم باری تعالیٰ میں مذکور ہے اُسْجُدُوا لِادَمِ ”آدم کو سجدہ کرو“ مومنوں کے سجدہ کے ذکر میں کہا کہ، وَاَسْجُدُوا وَعِبُدُوا رَبَّكُمْ ”سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو“۔ خانہ کعبہ آدم کی طرح نہیں ہو سکتا سوار جب نماز ادا کرتا ہے تو اس کا منہ خانہ کعبہ کی طرف نہیں ہوتا اور وہ معذور ہوتا ہے جب کسی جنگل میں جہت قبلہ معلوم نہ ہو سکے تو جدھر بھی منہ کر لیا جائے نماز ہو جاتی ہے ملائکہ کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے میں کوئی عذر نہیں تھا۔ ایک نے عذر تراشا اور ملعون و خوار ہو گیا اہل بصیرت کے لئے یہ دلائل واضح اور روشن ہیں۔

علاوہ ازیں ملائکہ صرف اس بناء پر کیسے افضل تر ہو سکتے ہیں کہ وہ حق معرفت میں بلند تر ہیں ان کی توجہ بہت ہی شہوات سے معرا ہوتی ہے ان کے دل حرص و آفت سے نا آشنا ہوتے ہیں ان کی طبیعت مکر و فریب سے پاک ہوتی ہے انکی غذا اطاعت خداوندی ہے اور ان کا مشرب فرمان حق کی بجا آوری ہے اس کے برعکس انسانی طبیعت شہوت کا مرکب ہے گناہوں کا مرکب ہونا انسانی کمزوری ہے، زینت دنیوی کی طلب اس کے دل پر طاری رہتی ہے، حرص و حیلہ اس کی طبع ثانی ہے شیطان اس پر اس قدر مسلط ہے کہ گویا اس کے رگ و پے میں خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے نفس امارہ جو جملہ شر کا منبع ہے اس کے قریب ہے جس کے وجود میں یہ تمام چیزیں ہوں اور وہ غلبہ ہوات کے باوجود فسق و فجور سے پرہیز کرے حرص و ہوا کے باوصف دنیا سے روگرداں ہو شیطانی وسوسوں کے وہتے ہوئے گناہوں سے بچے آفات نفسانی سے دور رہے عبادت، طاعت، مجاہدہ نفس اور مخالفت شیطان میں مشغول ہو۔ یقیناً اسی مخلوق سے افضل تر ہے جس طبیعت میں شہوات کی کش مکش نہ ہو۔ جو غذا کی ضرورت اور لذت سے ناواقف ہو جسے زن و فرزندہ ک غم نہ ہو جسے خویش و اقارب سے تعلق نہ ہو جو اسباب و آلات کی محتاج نہ ہو اور امید و ہم میں مبتلا نہ ہو۔

بخدا مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو افعال میں فضیلت تلاش کرتا ہے جمال میں عزت طلب کرتا ہے اور مال جمع کرنے میں بزرگی کی تمنا رکھتا ہے عنقریب یہ جاہ و منازوال پذیر ہوگا رب قدیر کے مصل پر نظر رکھنی چاہئے۔ رضائے حق کو عزت سمجھنا چاہئے معرفت اور ایمان میں بزرگی تلاش کرنا چاہئے تاکہ



*www.milliafsd.com*



## شذرات

☆..... وسوسے ایمان کے منافی نہیں اور ان پر مواخذہ بھی نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کبھی کبھی میرے دل میں ایسے بُرے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اس کو زبان سے نکالوں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ہے جس نے اس کے معاملہ کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا ہے (یعنی وہ خیالات صرف وسوسے کی حد تک ہیں تشکیک اور بد عملی کا موجب نہیں ہیں۔) (ابوداؤد و معارف الحدیث)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں میں ہمیشہ فضول سوالات اور چوں و چرا کا سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ یہ احمقانہ سوال بھی کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مخلوق کو پیدا کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس کو اس سے سابقہ پڑے وہ یہ کہہ کر بات ختم کر دے کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر میرا ایمان ہے۔ (بخاری و مسلم)

## ﴿خوش نصیب کون؟﴾

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زبان کو پکڑ کر کئی مرتبہ کھینچتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس کی وجہ سے اکثر لوگ جہنم میں داخل ہوں گے خوش نصیب ہے وہ انسان جس کی خاموشی فکر کے ساتھ ہو اور ان کی گفتگو ذکر کے ساتھ ہو یعنی انسان اگر خاموش ہے تو اللہ کی یاد میں لگا ہو اور اگر بات کرے تو نیکی کی بات کرے حضرت خواجہ باقی باللہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ اکثر خاموش رہتے ہیں، آپ کچھ نصیحت کیا کریں تاکہ لوگوں کو کچھ فائدہ ہو تو حضرت نے بہت پیاری بات فرمائی سونے کی ڈلیوں سے بھی پیاری فرمایا کہ جس نے ہماری خاموشی سے کچھ نہ پایا وہ ہماری باتوں سے بھی کچھ نہ پائے گا۔

☆..... کسی سنت کا احیاء (سوشہیدوں کا اجر)

حدیث شریف میں آیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کوئی چالیس حدیثیں



میری امت کو پہنچادے تو میں خاص طور پر اس کی سفارش کروں گا۔

## ﴿حضرت عمرؓ کی چھ نصیحتیں﴾

- 1- جو آدمی زیادہ ہنستا ہے، اس کا رعب کم ہو جاتا ہے۔
- 2- جو مذاق زیادہ کرتا ہے لوگ اس کو ہلکا اور بے حیثیت سمجھتے ہیں۔
- 3- جو باتیں زیادہ کرتا ہے اس کی لغزشیں زیادہ ہو جاتی ہے۔
- 4- جس کی لغزشیں زیادہ ہو جاتی ہیں، اس کی حیا کم ہو جاتی ہے۔
- 5- جس کی حیا کم ہو جاتی ہے اس کی پرہیزگاری کم ہو جاتی ہے۔
- 6- جس کی پرہیزگاری کم ہو جاتی ہے اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔ (حیۃ الصحابہ ۳: ۵۶۲)

## ﴿غریبی اور خوشحالی﴾

غریبی آتی ہے سات چیزوں کے کرنے سے:

- 1 جلدی جلدی نماز پڑھنے سے..... 2- کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے..... 3- پیشاب کرنے کی جگہ وضو کرنے سے..... 4- کھڑے ہو کر پانی پینے سے..... 5- منہ سے چراغ بجھانے سے..... 6- دانت سے ناخن کاٹنے سے..... 7- دامن یا آستین سے منہ صاف کرنے سے۔

خوشحالی آتی ہے سات چیزوں کے کرنے سے:

- 1- قرآن کی تلاوت کرنے سے..... 2- پانچوں وقت کی نماز پڑھنے سے..... 3- خدا کا شکر ادا کرنے سے..... 4- غریبوں اور مجبوروں کی مدد کرنے سے..... 5- گناہوں سے معافی مانگنے سے..... 6- ماں، باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے سے..... 7- صبح کے وقت سورہ لیسین اور شام کے وقت سورہ واقعہ پڑھنے سے۔

## ایک عجیب رات

دنیا میں ایک ایسی رات بھی گزری ہے جس میں ایک خلیفہ کا انتقال ہوا دوسرا اس کی جگہ تخت نشین ہوا اور تیسرا پیدا ہوا مرنے والا خلیفہ مہدی کا بیٹا ہادی ہے۔ تخت نشین ہونے والا ہادی کا بھائی ہارون الرشید اور پیدا ہونے والا ہارون الرشید کا بیٹا مامون رشید ہے۔



## یہ تو حسینؑ ہے!

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ ”جب حسنؑ پیدا ہوئے تو میں نے ان کا نام ”حرب“ رکھا، جب حضور ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے فرمایا ”مجھے میرا بیٹا دکھاؤ تم نے اس کا کیا نام رکھا ہے؟“ میں نے عرض کیا، ”میں نے اس کا نام ”حرب“ رکھا ہے۔“ یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: ”یہ تو حسنؑ ہے“ جب حسینؑ پیدا ہوئے تو آپ ﷺ تشریف لائے بچہ کے نام کے متعلق استفسار فرمایا، میں عرض کیا، ”میں نے اس کا نام حرب رکھا ہے“ اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”یہ تو حسینؑ ہے۔“

جب تیسرا لڑکا پیدا ہوا تو میں نے اس کا نام بھی حرب رکھا، حضور ﷺ تشریف لائے اور بچہ کا نام دریافت کیا تو میں پھر یہی عرض کیا ”میں نے اس کا نام حرب رکھا ہے“ چنانچہ حضور انور ﷺ نے رشاد فرمایا: ”یہ تو محسنؑ ہے۔“

پھر فرمایا میں نے ان تینوں بچوں کے نام حضرت ہارون علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیٹوں شبر، شبیر اور مشبر کے ناموں کے مطابق رکھے ہیں،

ابن اعرابیؒ حضرت فضلؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا، ”اللہ تعالیٰ نے حسن اور حسینؑ کے ناموں کو چھپایا ہوا تھا، چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے اپنے نواسوں کا نام ”حسن“ اور ”حسین“ رکھا۔“

## حضور علیہ السلام کی حضرت حسینؑ سے محبت

حضرت یعلیٰ بن مرہؒ فرماتے ہیں کہ ”ایک مرتبہ کچھ صحابہ کرامؓ اور حضور اقدس ﷺ ایک دعوت میں کھانا تناول فرمانے جا رہے تھے اس دوران حضرت حسینؑ ایک گلی میں کھیل رہے، حضور اقدس ﷺ انہیں دیکھ کر لوگوں سے آگے بڑھ گئے اور اپنی بانہوں کو پھیلا لیا، حضرت حسینؑ (بچپن کی مستی میں آکر) ادھر ادھر بھاگنے لگے اور حضور اقدس ﷺ انہیں ہنسانے اور بہلانے لگے اور بالآخر انہیں پکڑ لیا، پھر اپنا ایک دست مبارک حضرت حسینؑ کی ٹھوڈی کے نیچے رکھا اور دوسرا ہاتھ ان کے سر پر رکھا اور پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت حسینؑ کا بوسہ لیا اور فرمایا، ”حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں جو اس سے محبت کرے اللہ اس سے محبت کرے۔“

(رواہ ابن ماجہ، ص: ۴۴ مختصر، کنز العمال، ج: ۷، ص: ۱۰۷)



قسط 9

کائنات کی تخلیق کے سلسلہ میں فلسفہ قدیم اور سائنسی نظریات کی تردید اور اسلامی نظریہ تخلیق کا اثبات و احقاق

حذیفہ وستانوی

(یعنی) قبل المسیح پانچ سو سے ۲۰ ویں صدی تک کائنات کے بارے میں مشہور فلسفیات و سائنسی نظریات کی نقل و تردید اور اسلامی نظریہ تخلیق کائنات کا قرآن وحدیث اور علماء حق کے اقوال کی روشنی میں مدلل اثباتی بیان

## زمین کی حیرت انگیز تخلیق اور بناوٹ:

زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی، مگر اس کے باوجود وہ ہماری تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے، کیوں کہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں، جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجئے، اگر اس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہو جاتی مثلاً کرۂ زمین کا حجم، اگر چاند جیسا چھوٹا ہوتا یعنی اس کا قطرہ موجودہ قطر کی نسبت سے ایک بٹا چار ہوتا تو اس کی کشش ثقل، زمین کی موجودہ کشش کا ایک بٹا چھ رہ جاتی، کشش کی کمی کا نتیجہ یہ ہو جاتا کہ ہماری دنیا پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی، جیسا کہ جسامت کی اسی کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا، چاند پر اس وقت نہ تو پانی ہے، اور نہ کوئی ہوا کرہ ہے، ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بے حد سرد ہو جاتا ہے،

اور ان دن کے تنور کے مانند جلنے لگتا ہے، اسی طرح کم جسامت کی زمین جب کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کو روک نہ سکتی جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا اہم ذریعہ ہے، اور اسی بنا پر ایک سائنس داں نے اس کو عظیم توازنی پہیہ (Great Balance Wheel) کا نام دیا ہے، اور ہوا کا موجودہ غلاف اڑ کر فضا میں گم ہو جاتا تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی سطح پر درجہ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک چڑھ جاتا، اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا، اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ کی نسبت سے دگنا ہوتا تو اس کی کشش ثقل بھی دگنی بڑھ جاتی، کشش کے اس اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا،



جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے، وہ کھینچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی، اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہوتا جاتا، جس کا رد عمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوتا، اور اگر زمین سورج کے اتنی بڑی ہوتی اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی، ہوا کے غلاف کی دبازت گھٹ کر پانچ سو میل کے بجائے صرف چار میل رہ جاتی، نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہنچتا،

اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کا نشوونما ممکن نہ رہتا، ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو جاتا انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہو جاتا اور اس میں کسی قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہو جاتی، کیوں کہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے، اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جاسکتا ہے۔

بظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس کے نیچے سر کے بل لٹکے ہوئے ہیں، زمین گویا فضا میں متعلق ایک گیند ہے جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں، کوئی شخص ہندوستان کی زمین پر کھڑا ہو تو امریکہ کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے، اور امریکہ میں کھڑا ہو تو ہندوستان اس کے نیچے ہوگا، پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے،

ایسی حالت میں زمین کی سطح پر ہمارا انجام وہی ہونا چاہئے، جیسے سائیکل کے پہیے پر کنکریاں رکھ پہیے کہ تیزی سے گھما دیا جائے، مگر ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہیں،

زمین کے اندر غیر معمولی قوت کشش ہے جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، اور اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑتا ہے، اسی دو طرفہ عمل نے ہم کو زمین کے گولے پر چاروں طرف لٹکا رکھا ہے، ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑتا ہے، وہ جسم کے ہر ایک مربع انچ پر تقریباً ساڑھے سات سیر تک معلوم کیا گیا ہے،



یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۸۰ من کا دباؤ، آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا، کیوں کہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے، دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے، اس لئے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا، جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا..... جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے، اس کے بے شمار دیگر فائدے ہیں جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں، اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، چنانچہ اس نے کہا کہ اس کی کوئی جوجیہہ پیش نہیں کر سکتا، وائٹ ہڈ (A.N.Whitehad) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

”نیوٹن یہ کہہ کر ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے، کیوں کہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے، تو وہ ہم کو تو جیہہ نہیں دے سکتی، ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بنا سکتا، تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں، جب کہ مردہ کائنات میں کسی مقصدیت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔“ (The Age Andysis, p.85)

وائٹ ہڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحب شعور کے زیر اہتمام نہیں ہے، تو اس کے اندر استثنیٰ معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے، یا یوں کہئے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے، فرض کرو اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہو جائے اور یہ بالکل ممکن ہے ایسی صورت میں ہمارے دن اور ہماری راتیں موجودہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں گے،

گر میوں کا سخت سورج ہر دن تمام نباتات کو جلادے گا اور جو بچے گا وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے کی نذر ہو جائے گا، سورج جو اس وقت ہمارے لئے زندگی کا سرچشمہ ہے، اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپرچر ہے، اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے، یہ واقعہ ہمارے لئے بے حد اہمیت



رکھتا ہے، کیوں کہ اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے،

مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب آجائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس گرمی سے کاغذ جلنے لگے، اور موجودہ فاصلہ دگنا ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زندگی باقی نہ رہے یہی صورت اس وقت پیدا ہوگی جب موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے مثلاً ایک بہت بڑا ستارہ ہے جس کی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے، اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

زمین ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے، یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتا ہے، اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آباد کاری کے قابل ہو گیا ہے، اور مختلف قسم کے نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں، اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا، سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان، اس طرح کے بہت سے اثرات ہوتے جس کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔

یہ کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کر لیا!

اگر سائنس دانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداءً زمین کا درجہ حرارت وہی رہا ہوگا جو سورج کا ہے، یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ، اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی، آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک زمین کا درجہ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آجائے، اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا،

اس کے بعد کروڑوں سال تک زمین کی سطح اور اس کی فضا میں زبردست انقلابات ہوتے رہے، یہاں تک کہ غالباً ایک ملین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی، زمین کی فضا میں گیسیں تھیں ان کا ایک بڑا حصہ خلا میں گیا، ایک حصہ نے پانی کے مرکب کی صورت اختیار کی، ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا، اور ایک حصہ ہوا کی شکل میں ہماری



فضا میں باقی رہ گیا جس کا بیشتر جزو آکسیجن اور نائٹروجن ہے یہ ہوا اپنی کثافت کے اعتبار سے زمین کا تقریباً دس لاکھواں حصہ ہے۔ کیوں کہ نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہو جاتیں؟ یا کیوں ایسا نہیں ہوا کہ موجودہ کی نسبت ہے ہوا کی مقدار بہت زیادہ ہوتی؟ دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا، یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ فی مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی پیدا بھی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشوونما پاسکے۔

زمین کی اوپری پرت اگر صرف دس فٹ موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا، جس کے بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے، اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکیں اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں اور رات کے وقت ہم کو جلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، وہ زمین کے ہر حصے میں گرتے، یہ شہابے چھ سے چالیس میل تک فی سکند کی رفتار سے سفر کرتے ہیں،

وہ زمین کے اوپر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے شہاب ثاقب کی بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ رفتار آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے کر دیتی ہے، مگر ہوائی کرہ اپنی نہایت موزوں دبازت کی وجہ سے ہم کو اس آتشیں بوچھاڑ سے محفوظ رکھتا ہے، ہوائی کرہ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورج کی کیمیائی اہمیت رکھنے والی شعاعیں (Actinic Rays) اسی موزوں مقدار سے زمین پر پہنچتی ہیں، جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لئے ضرورت ہے، جس سے مضر بیکٹیریا مر سکتے ہیں جس سے وٹامن تیار ہو سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

کمیت کا اس طرح عین ہماری ضرورتوں کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے!!!!!!

زمین کی اوپری فضا چھ گیسوں کا مجموعہ ہے جس میں تقریباً ۷۸ فیصدی نائٹروجن اور ۲۱ فیصدی آکسیجن ہے، باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پاتی جاتی ہیں، اس فضا سے زمین کی سطح پر تقریباً پندرہ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے جس میں آکسیجن کا حصہ تین پونڈ مربع انچ



ہے، موجودہ آکسیجن کا بقیہ حصہ زمین کی تہوں میں جذب ہے، اور وہ دنیا کے تمام پانی کا آٹھ بٹاؤں حصہ بناتا ہے، آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کے لئے سانس لینے کا ذریعہ ہے، اور اس مقصد کو فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیسیں کس طرح آپس میں مرکب ہوئیں اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لئے ضروری تھا، مثال کے طور پر آکسیجن اگر ۲ فیصدی کے بجائے پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جز ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا،

اسی طرح اگر اس کا تناسب گھٹ کر دس فیصدی رہتا تو ممکن ہے زندگی صدیوں کے بعد اس سے ہم آہنگی اختیار کر لیتی مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کر سکتی تھی، اور اگر آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہو گئی ہوتی تو حیوانی زندگی سر سے ناممکن ہو جاتی۔

آکسیجن ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور کارب گیسیں الگ الگ اور مختلف شکلوں میں مرکب ہو کر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں، یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر زندگی قائم ہے، اس کا ایک فی ارب بھی امکان نہیں ہے کہ وہ تمام ایک وقت میں کسی ایک سیارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکٹھا ہو جائیں، ایک عالم طبیعیات کے الفاظ میں:

"Science has on explanation to offer for the facts,  
and to say it is accidental is to defy mathematics."

یعنی سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہ کے لیے کوئی چیز نہیں ہے، اور اس کو اتفاق کہنا ریاضات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔

ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔ (مذہب اور جدید چیلنج)



## نعت

(حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابو ذر بخاریؓ)

آفتاب آئے ماہتاب آئے  
ساری دنیا مثالِ دوزخ..... تھی  
ساری دنیا پہ تھی محیط خزاں  
زنگ خوردہ تھا شیشہ دل و روح  
کفر بے ڈھب سوال کرتا تھا  
آپ ﷺ آئے تو ہو گئی..... تنویر  
عقل ڈوبی، ابھر گیا الہام  
حق یہی تھا، نبی ﷺ کی مسند پر  
آئے صدیقؓ پھر عمر فاروقؓ  
پھر حسنؓ اور معاویہؓ کو سلام  
اُن کے اصحاب پر درود و سلام

اُن کے اعدا کے منہ میں خاک پڑے

ان پہ آنا ہے جو عذاب آئے

ماہنامہ ملیہ کیلئے مضامین بھیجنے والے حضرات متوجہ ہوں!

رسالہ کے صفحات آپ کی نگارشات کیلئے حاضر ہیں

برائے مہربانی اپنے مضامین ان پیج (INPAGE) میں ٹائپ کروا کر ہماری ای

میل milliafsd@yahoo.com پر اس ان پیج فائل کو Attach کر کے بھجوائیں۔

اس سے اغلاط کا امکان کم ہو جاتا ہے، اور سرلیج الاشاعت ہے۔



فیصل آباد  
پاکستان

# ماہنامہ ملیہ

بفیض

حضرت سید نفیس الحسنی  
شاہ صاحب رحمہ اللہ

بیاد

حضرت مولانا انیس الرحمن لدھیانوی  
خلیفہ مجاز حضرت شاہ عبدالقادر راپوری

○ عصر حاضر کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ۔

اس میں وہ سب کچھ جس سے ہر ایک مسلمان کا باخبر رہنا ضروری ہے۔

○ تاریخی حقائق سے مزین علمی مقالہ جات

○ بے لاگ تبصروں اور تحقیقاتی تجزیوں سے بھرپور

○ نقطہ نظر کا کالم ہر لکھنے والے کے لئے

○ طلباء، خواتین اور بچوں کے خصوصی صفحات

○ حصہ شعر و سخن۔ جس میں حمد و نعت، نظم اور غزل۔

○ آپ کے مسائل اور ان کا حل

پاکستان میں سالانہ 200 روپے

بیرون ملک سالانہ بذریعہ ہوائی ڈاک 40 امریکی ڈالر

○ دینی مدارس کے طلباء اور اساتذہ کیلئے خصوصی رعایت

ماہنامہ ملیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ محلہ خالصہ کالج فیصل آباد  
فون 041-8711569

رابطہ کیلئے

E-mail: milliafsd@yahoo.com



MONTHLY  
MAGAZINE

**Millia**  
JAMIA MILLIA ISLAMIA

FAISALABAD  
PAKISTAN  
Reg:M # FD-16

MOHALLAH KHALSA COLLEGE FAISALABAD Ph:041-8711569  
E-mail: milliafsd@yahoo.com Fax # 041-8502213

داخلی  
جاری ہے

اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنے کے لئے آپ کا بہترین انتخاب

خوشخبری

گرامر سکول

اسلامیہ

AL ANEES



الانيس

انگلش میڈیم

سمیسٹر سسٹم

کلاسز

نمایاں خصوصیات

بہترین اعلیٰ کوالیفائیڈ مہارت یافتہ اساتذہ

پلے نرسری تا میٹرک  
ناظرہ لازمی، حفظ القرآن اختیاری  
کمپیوٹر لیب  
جدید لیبارٹری  
جدید لائبریری

روزمرہ کی مسنون دعائیں  
انفرادی توجہ اور والدین سے مسلسل رابطہ  
جدید تقاضوں سے ہم آہنگ طرز تدريس  
صاف ستھرا کشادہ ماحول  
مارپیٹ سے پاک تربیتی ماحول  
ایئر کنڈیشنڈ کلاس رومز  
ٹرانسپورٹ کا معقول انتظام

آکسفورڈ انگلش سسٹم کے ساتھ  
پلے اور نرسری کی کلاسز کا منفرد انتظام  
دینی شعار اور اقدار کے مطابق تربیت  
ہفتہ وار، ماہانہ پراجیکٹس رپورٹ  
انگلش بول چال کا ماحول  
بہترین قراء اکرام کی زیر نگرانی حفظ قرآن کریم کا اہتمام  
حفظ کے بعد پڑھائی کے ساتھ سکول میں دہرائی کا انتظام

سٹریٹ نمبر 8 نزد جامع مسجد حبیبیہ حنفیہ کینال روڈ فاروق آباد فیصل آباد

Just for Contact 041-8534987



www.milliafsd.com